ماہنامہ
محدث
بنارس

شمارہ/۴	ربیع الآخر ۱۴۳۰ھ	اپریل ۲۰۰۹ء	جلد/ ۲۷

مدیر
عبدالوہاب حجازی

پتہ
دارالتالیف والترجمہ
بی ۱۸/۱جی، ریوڑی تالاب
وارانسی - ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک
سالانہ ۱۲۰/ روپئے
فی پرچہ ۱۲/ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔

اس شمارہ میں

۱-درس قرآن	عبداللہ سعود بن عبدالوحید	۲
۲-درس حدیث	مولانا عبدالسلام مدنی	۳
۳-افتتاحیہ	مدیر	۴
۴-ماکولات ومشروبات میں حلت وحرمت	ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری	۶
۵-تکبر ایک خطرناک بیماری	محمد انور محمد قاسم سلفی	۱۱
۶-تعلیمی اور سیاسی بیداری	مولانا محمد مظہر الاعظمی	۱۷
۷-بانیان ومنتظمین مدرسہ دارالحدیث...	مولانا اسعد اعظمی	۲۴
۸-شیخ عبدالعزیز بن بازؒ اور خدمت خلق	مامون مظہر	۳۱
۹-۱۸۵۷ء کی دِلّی غالب کے.....	ڈاکٹر رشیدہ خاتون	۳۹
۱۰-باب الفتاوی	نورالہدی عین الحق سلفی	۴۸

نوٹ : ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

درس قرآن

اللہ کے حضور.....باادب باملاحظہ

عبداللہ سعود بن عبدالوحید

﴿يَا بَنِيْ آدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (الاعراف:۳۱)

اے آدم کی اولاد! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا زینت (کا لباس) پہن لیا کرو، اور کھاؤ پیو اور اسراف مت کرو، بیشک وہ (اللہ) اسراف کرنے والے سے محبت نہیں کرتا۔

یہ خطاب تمام انسانوں سے ہے اگر چہ اس سے ان کفار کو روکا گیا جو بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر کیا کرتے تھے۔

مسجد میں حاضری کے وقت زینت اختیار کرنے کا حکم ہے، زینت سے مراد وہ لباس ہیں جو انسان اپنی زینت وآرائش کے لئے بناتا ہے، اللہ تعالی نے حکم دیا کہ جب اللہ کے دربار میں حاضری کا وقت آئے اور مسجد جانا ہو تو زینت اختیار کرو، زینت میں اچھا کپڑا، خوشبو وغیرہ شامل نہیں جیسا کہ جمعہ کے دن غسل اور خوشبو کے استعمال کی ترغیب دی گئی ہے۔

آج آسائش کا دور ہے، فنکشن وغیرہ میں لوگ اچھا سے اچھا کپڑا استعمال کرتے ہیں مگر دیکھا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں لوگ رات کے لباس میں مسجد میں آجاتے ہیں، یہ اللہ کے حضور حاضری ہے جو بادشاہوں کا بادشاہ اور ملک الملک ہے، اس کا خیال ہونا چاہئے۔

لباس زینت کے ساتھ کھانے پینے کا بھی ذکر ہے کہ کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو جو اللہ کو ناپسند ہے۔

اسلام فطری مذہب ہے جس میں انسان کے مزاج کے مطابق معتدل احکام وارد ہیں، ہم آخرت کی تلاش میں یا اخروی زندگی کی سرخ روئی کے لئے ترک دنیا نہیں کر سکتے، جو لوگ رہبانیت کا راستہ اختیار کرتے ہیں، بہت زیادہ سادہ لباس پہن کر یا سوکھا روکھا کھا کر زندگی گذارتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم کو نیکی ملے گی اور ہم اللہ کے مقرب بن جائیں گے، وہ غلط فہمی میں ہیں اور اسلام کی تعلیمات سے ناآشنا ہیں، انسان کو اپنے معیار اور آسائش کے اعتبار سے کھانا پینا اور پہننا چاہئے، اگر کوئی معاش میں کمزور ہے تو وہ اپنے حالات کے اعتبار سے اپنی زندگی گزارے اور بہتر حالت میں رہے اور مسجد کی حاضری میں زینت اختیار کرے، اسی طرح ایک متمول انسان اپنے آسائش کے مطابق کھائے پیئے اور کپڑا استعمال کرے، اگر وہ اعتدال میں رہ کر اچھا پہنے اور کھائے تو اس کو اسراف نہیں کہیں گے، اللہ کے نبی ﷺ سے مسند احمد میں منقول ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے بندے پر ظاہر ہو۔

اس آیت کریمہ سے نماز کے لئے حاضری کے وقت اہتمام کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالی ہم کو متقی اور نیکوکار بنائے اور اپنے محبوب بندوں میں جگہ دے، آمین۔

☆☆☆

درس حدیث:۱۲۳

شرعی مسائل میں کلام کے آداب وشرائط

تحریر: مولانا عبدالسلام مدنی/استاذ جامعہ سلفیہ، بنارس

عن عبد الله، قال: يا أيها الناس! من علم شيئا فليقل به، ومن لم يعلم فليقل: الله أعلم. فإن من العلم أن تقول لما لا تعلم: الله أعلم. قال الله تعالى لنبيه: ﴿قل ما أسئلكم عليه من أجر، وما أنا من المتكلفين – ص: ٨٦﴾. متفق عليه. (مشكاة ج١، ص ٣٧)

قال الرحمانيؒ: أخرجه البخاري في الاستسقاء، .....، ومسلم في التوبة، ..... (مرعاة ج١، ص ٣٥٨)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اے لوگو! جو انسان (دینی بات) جانتا ہو (اور صاحب فہم فرد نے دریافت کیا ہو) تو وہ بیان کرے، اور جو نہ جانتا ہو (تو جواب میں) ''اللہ اعلم'' کہے، (یعنی اللہ تعالی جانتا ہے) اس لئے کہ علم شریعت سے یہ بات ہے کہ جس چیز کو تم نہیں جانتے ہو تو اس سلسلہ میں ''اللہ اعلم'' کہو، اللہ تعالی نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا ہے: ﴿قل ما أسئلكم عليه من أجر، وما أنا من المتكلفين﴾ یعنی ''آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس (دعوت وتبلیغ) پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا، اور نہ میں تکلف کرنے والوں میں سے ہوں''۔ (جونا گڈھیؒ) ''یعنی اپنی طرف سے گھڑ کر اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کردوں جو اس نے نہ کہی ہو''۔ (حاشیہ ترجمہ) (بخاری ومسلم)

تشریح: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اثر سے ثابت ہوتا ہے کہ شرعی مسائل میں علم وبصیرت کے بعد ہی کلام کیا جاسکتا ہے، اور اگر شرعی مسئلہ معلوم نہیں ہے تو ''اللہ اعلم'' ہی استفسار کے وقت جواب دینا لازم ہے، یہی آداب دین وشریعت ہے۔ بصورت دیگر آدمی گمراہ، اور گمراہ گر بن جائے گا۔

ایک مرفوع روایت کے الفاظ ہیں: ..... اتخذ الناس رؤسا جهالا، فسئلوا، فأفتوا بغير علم، فضلوا وأضلوا۔ (متفق علیہ) (مشکاۃ مع المرعاۃ ج۱، ص۳۱۱)

یعنی اللہ جب دنیا سے علماء کو اٹھالے گا، لوگ اپنے سردار جاہلوں کو بنالیں گے پھر ان سے (فیصلے اور فتاوے) طلب کئے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، تو خود گمراہ ہوں گے اور غیروں کو گمراہ کریں گے۔ (بخاری ومسلم)

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالی کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جس کا بندہ کو علم نہ ہو شدید تر حرام قرار دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قل إنما حرم ربي الفواحش .....، وأن تقولوا على الله ما لا تعلمون – الأعراف: ٣٣﴾ یعنی ''آپ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے ان تمام فحش باتوں کو جو علانیہ ہیں، اور جو پوشیدہ ہیں، اور ہر گناہ کی بات کو، اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ کے ذمے ایسی بات لگادو جس کو تم جانتے نہیں''۔ (جونا گڈھیؒ)

علامہ ابن القیمؒ اس آیت مبارکہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قد حرم الله القول عليه بغير علم في الفتيا والقضاء، وجعله من أعظم المحرمات بل جعله في المرتبة العليا منها، قال الله تعالى: ﴿قل إنما حرم ربي ..... الآية﴾ (شرح العقیدۃ الواسطیۃ، ص۵۶)

یعنی فتوی وقضاء میں بغیر علم کے کلام کرنے کو اللہ تعالی نے حرام کردیا ہے، اور اسے محرمات شرعیہ میں سب سے اونچے درجہ میں رکھا ہے جیسا کہ آیت مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے۔

رب العالمین! ہمیں عالم بابصیرت بنا، اور شرعی مسائل میں علم ہی کی روشنی میں کلام کرنے کی توفیق عنایت فرما، آمین۔ ☆☆☆

افتتاحیہ

لباس میں سادگی
ایمان کا حصہ ہے

سادگی کے معنی یہ ہیں کہ عمدہ لباس پہننے کی طاقت آدمی کو ہے لیکن دوسروں پر بڑائی ظاہر کرنے سے بچتے ہوئے اللہ کو خوش کرنے کے لئے تواضع اختیار کرے اور تکلف اور بناوٹ سے پرہیز کرے تو یہ ایمان کا مظہر ہے اور اللہ کی نظر میں بندے کی یہ ادا بے حد پسندیدہ ہے، ایک حسن درجہ کی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

" من ترك اللباس تواضعا لله وهو يقدر عليه دعاه الله يوم القيامة على رؤوس الخلائق حتى يخيره من أي حلل الايمان شاء يلبسها".

جس شخص نے اللہ کو خوش کرنے کے لئے تواضع وخاکساری کے طور پر عمدہ لباس پہننا چھوڑ دیا، حالانکہ اس کو اس اس کی طاقت ہے تو اللہ تعالی اسے قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اسے اختیار دے گا کہ ایمان کا جو جوڑا چاہے پہن لے۔

ایمان کے جوڑے وہ جنتی لباس ہوں گے جنہیں اللہ تعالی صرف ایمان داروں کو پہنائے گا، حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ تعالی بندوں پر اپنی نعمتوں کے آثار دیکھنا چاہتا ہے، اس لحاظ سے اچھے اور عمدہ لباس پہننا منع نہیں بلکہ جائز ہے، البتہ دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے کے لئے اچھے لباس پہننا ناجائز ہے، آدمی کو اس سلسلہ میں اپنے ارادے اور نیت کا محاسبہ کرتے رہنا چاہئے کہ نیت کے خراب ہونے سے جائز چیز گناہ بن جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایک بار آپ ﷺ کے پاس دنیا کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا:

" ألا تسمعون ؟ ألا تسمعون ؟ إن البذاذة من الإيمان، ان البذاذة من الإيمان". (ابوداود، کتاب الترجل)

کیا تم لوگ سنتے نہیں ہو؟ کیا تم لوگ سنتے نہیں ہو بے شبہ سادگی ایمان کا حصہ ہے۔

انسان پہننے اوڑھنے اور کھانے پینے وغیرہ میں جس قدر تکلفات اور تصنعات میں آگے بڑھتا جائے گا دنیا کے چنگل میں پھنستا جائے گا اور آخرت کے لئے اعمال انجام دینے کی فکر کمزور ہوتی جائے گی، اس لئے ان حدیثوں میں سادگی اختیار

کرنے کی ترغیب ایک مومن کو دین پر استقامت، آخرت کی یاد اور اللہ کے لئے اعمال انجام دینے کی راہ پر قائم ودائم رکھنے کا بہترین اصول ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے رسول ﷺ اور آپ کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سادگی کا بہترین نمونہ تھے، اوران کی مبارک زندگیاں ہمارے لئے بہترین اسوہ ہیں۔

مروج الذہب وغیرہ کتابوں میں یہ واقعات مذکور ہیں کہ: خلیفۂ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر شام میں جنگ کے لئے جب یمنی مجاہدین کے قافلے مدینہ میں اکٹھا ہوئے تو ذوالکلاع حمیری نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دبلا پتلا اور بوڑھا شخص پایا اور دیکھا موٹا جھوٹا کپڑا پہنے ہوئے ہیں لیکن چہرہ تقوی سے دمک رہا تھا اور ذوالکلاع سر پر تاج سجائے ہوئے کپڑے کے جوڑوں پر جواہرات چمکتے ہوئے اوران کی چادر پر سونے کے تاروں میں موتی، یاقوت اور مونگے جڑے ہوئے تھے، خلیفہ رسول کی سادگی اور ہیبت نے ان پر اثر ڈالا اور اپنے لباس انہوں نے اتار دیئے اور خلیفۂ رسول کی طرح سادہ لباس پہن لیا، ہزاروں افراد جوان کے قافلے میں تھے انہوں نے کہا آپ نے ہمیں لوگوں کے درمیان رسوا کر دیا تو ذوالکلاع نے کہا کیا جس طرح میں جاہلیت میں سرکش تھا اسلام میں بھی سرکش رہوں، واللہ ایسا ہرگز نہ ہوگا، اللہ کی فرماں برداری تواضع اور دنیا سے بچ کر ہی ہوسکتی ہے، پھر ذوالکلاع حمیری کی طرح یمن کے دوسرے بادشاہوں نے بھی اپنے قیمتی تاج اور قیمتی جوڑے اتار کر سادہ کپڑے زیب تن کر لئے، خلیفۂ رسول نے ان تاجوں اور جوڑوں کو بیت المال میں داخل کر دیا، شاہان یمن نے دیکھا کہ خلیفۂ رسول بازاروں میں گھومتے اور عام سادہ لباس پہنتے ہیں جب کہ پورے جزیرۂ عرب پر ان کا حکم چلتا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ اس ظاہری زیب وآرائش سے بھی بڑی چیز کوئی ہے اور وہ عظمت نفس ہے، وہ خلیفۂ رسول سے ملنے میں شرم کھانے لگے، اپنے کو حقیر سمجھنے لگے، یہاں تک کہ انہوں نے خلیفۂ رسول کی مشابہت اختیار کر لی اور اس آفتاب خلافت رسول کی کہکشاں میں شامل ہوکر دنیا کو اپنے اپنے طور پر روشنی پہنچانے لگے۔

سادگی اختیار کرنا، اول اول نفس پر گراں معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر آخرت پیش نظر ہو اور عمل میں اللہ کی رضا مقصود ہو تو سادگی کا عادت میں داخل ہوجانا مشکل نہیں، جدید دور کے امراء، اصحاب ثروت، علماء، طلباء اور عام نوجوانوں کے لئے اس میں بڑا سبق اور روشن مستقبل کی دعوت وضمانت ہے، اللہ ہماری نگہبانی فرمائے۔

☆☆☆

ماکولات ومشروبات میں حلت وحرمت

(قسط:۱) ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری

الحمد لله رب العالمين، والعاقبة للمتقين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، وعلى آله وصحبه أجمعين، أمابعد:

اللہ تعالی کا بے پایاں فضل وکرم ہے کہ اس نے جن وانس کی ہدایت کے لئے دین اسلام کو منتخب فرمایا، محمد ﷺ کو اپنا رسول ونبی بنایا، آپ ﷺ پر قرآن کریم نازل فرمایا، اوراس کی تفسیر وتبیین کے لئے حدیث شریف کی وحی فرمائی، آپ ﷺ نے ۲۳ سال کی مختصر مدت میں صحابہ کی جماعت کی تربیت فرمائی جو دنیا کی سب سے افضل اور مثالی جماعت ہے، اسلام کی یہ ایک عظیم خصوصیت ہے کہ اس کی تعلیمات کی عملی صورت عصرِ نبوت سے آج تک برابر موجود رہی ہے، اور کسی بحرانی وقت میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ عملی صورت دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو۔

اسی طرح اسلام کی یہ بھی قابل ذکر خصوصیت ہے کہ اس کی تعلیمات کا کوئی جزئیہ کسی بھی دور میں علم وعقل کے خلاف نظر نہیں آیا۔ شروع دور سے ہی معترضین نے کوشش کی کہ اسلام کو انسانی مصلحتوں کے خلاف بتائیں، یا اس کے احکام کا علم وعقل کے مسلمات سے تصادم ثابت کریں، لیکن اللہ تعالی کی مدد سے ان کو ہمیشہ ناکامی رہی، آج کے دور میں بھی اس طرح کی کوششیں کہیں کہیں نظر آتی ہیں، لیکن ان میں عناد کا پہلو زیادہ اور علم کا پہلو کم ہے، کیونکہ سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کے اس عہد میں اسلام کی بیشتر تعلیمات کی فلاسفی علمی نظریات وتجربات سے ثابت ہوگئی ہے، لہذا جواب کے لئے ذہنی کاوش کی زیادہ ضرورت نہیں، پھر بھی اسلامی تعلیمات کے ہر پہلو کو اس کے فوائد ومصالح کے ساتھ انسانیت کے سامنے لانا ہے تاکہ ماننے والوں اور انکار کرنے والوں میں سے کسی کے پاس کوئی عذر نہ رہے۔

اسی مقصد کے لئے علماءِ اسلام نے قدیم عہد سے اس موضوع پر توجہ دی، اور کتبِ تفسیر وحدیث میں حسبِ موقع احکام شریعت کی مصلحتوں کو واضح فرمایا، اور اپنے عہد کے ثقافتی معیار کا لحاظ کرتے ہوئے تشفی بخش بحث کی، عہد عباسی میں معتزلہ کی تعقل پسندی شباب پر تھی، اور انہوں نے طاقت کے سہارے اور عقلیات میں تفوق کے سبب سادہ لوح لوگوں کو کسی حد تک مرعوب بھی کرلیا، لیکن علماء اسلام اور محدثین کرام نے خالص علمی اور سنجیدہ انداز میں ان کا جواب دیا، اور ثابت کیا کہ اسلام کا

کوئی حکم عقل سلیم یا انسانی مصلحت کے خلاف نہیں، اللہ تعالی کا شکر ہے کہ اعتزالی اعتراضات ہوا میں تحلیل ہو گئے، اور ائمہ دین کی علمی کاوشیں آج بھی زندہ ومفید ہیں: ذلك فضل الله۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے درء تعارض العقل والنقل نامی کتاب لکھی، اور انسانی ذہن میں جو اعتراضات پیدا ہو سکتے تھے ان کی تشفی کا سامان فراہم کیا، شیخ الاسلام کے اسلام پر بہت سے احسانات ہیں، لیکن اس احسان کی اہمیت کچھ اور ہے، خوشی کی بات ہے کہ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ (ریاض) نے چند برس قبل اس کتاب کو اور شیخ الاسلام کی متعدد دوسری کتابوں کو بھی تحقیق وتعلیق کے بعد دیدہ زیب انداز میں شائع کیا ہے۔

شیخ الاسلام کے شاگرد علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے بھی اپنی مختلف تصنیفات میں احکام شریعت کی حکمتوں پر بحث کی ہے، ان کے قلم کی شگفتگی نے اس موضوع کی گفتگو کو بہت زیادہ تشفی بخش بنا دیا ہے، استاد شاگرد دونوں کی کوشش یقیناً اس درجہ کی ہے کہ اس سے شریعت کا مطالعہ کرنے والوں کی پوری تشفی ہو جائے گی، اعلام الموقعین اور زاد المعاد وغیرہ کتب میں جو مباحث موجود ہیں ان پر اضافہ مشکل ہے۔

جدید دور میں بھی مصالح احکام اور اسرار شریعت کے موضوع پر علماء اسلام کی توجہ برقرار رہی، اور انہوں نے احکام کی حکمت اور اعتراضات کے جواب پر مشتمل قابل قدر ذخیرہ تیار کر دیا۔ خوشی کی بات ہے کہ علمی دنیا اس موضوع کے تعلق سے بھی ہندوستان کا نام لیتی ہے، حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے نام سے جو کتاب تصنیف کی اس کا شہرہ علمی دنیا میں آج بھی ہے، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بڑی بالغ نظری سے مصالح احکام پر گفتگو کی ہے، اور شریعت کے ہر حکم پر اس کے پس منظر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بحث کی ہے، یہ کتاب آج بھی اپنے موضوع پر عرب وعجم کا مرجع ہے۔

اس مقام پر ایک ازہری مصری عالم شیخ علی احمد الجرجاوی کی کتاب ''حکمۃ التشریع وفلسفتہ'' کا نام بھی لینا چاہتا ہوں، موصوف نے مصالح احکام کو نمایاں کرنے میں اچھی کوشش کی ہے، اور خصوصیت کے ساتھ مغربی مصنفین کے حوالہ سے اور مغرب سے شائع ہونے والے مضامین اور رپورٹوں کے حوالہ سے اسلامی احکام میں مصالح کے پہلو کو واضح کیا ہے۔

مصر ہی کے ایک اور عالم عبد الرزاق نوفل کا ذکر بھی ضروری ہے، موصوف کی ایک کتاب ''بین الدین والعلم'' اور دوسری کتاب ''اللہ والعلم الحدیث'' ہے۔ دونوں کتابوں میں مصنف نے قرآن کریم کی بعض آیات اور اسلام کے مسلمہ عقائد واحکام کا ذکر کر کے اسی سے متعلق سائنس کا نظریہ ذکر کیا ہے، اس کوشش کا مقصود یہ نہیں کہ سائنس سے اسلام کے لئے تصدیق فراہم کی جائے، بلکہ دین اسلام کی فطری حیثیت اور قدرت خداوندی کا اظہار ہے۔

برصغیر میں نصرانی مبلغین، آریہ سماجی معترضین اور اتباع مرزا قادیانی کی طرف سے اسلام پر بہت زیادہ اعتراضات کئے گئے، برصغیر کے علماء اسلام نے ان اعتراضات کے جواب میں بڑے اخلاص ومحنت کا ثبوت دیا، اور مخالفین کو پوری طرح خاموش کردیا۔ علماء اسلام کے ان جوابات میں ایک بڑا حصہ احکام کی فلاسفی سے متعلق ہے، علماء نے انسانی فطرت اور شرعی احکام کے تناظر میں ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو جس طرح کے احکام کا پابند کیا ہے، سیرت کی تعمیر اور اخروی ودنیوی نجات وکامیابی کے لئے ان سے بہتر کا تصور نہیں کیا جاسکتا! بات احکام شریعت میں کسی طرح کی کمی کی نہیں، بلکہ ان کی مخلصانہ پابندی کی ہے، غور کیجئے کہ خالق کائنات نے اپنا دین نازل فرما کر امت انسانی سے اپنے اوپر ایمان اور ان احکام پر عمل کا مطالبہ فرمایا، لیکن لوگوں نے اس کا جواب کفر وشرک اور بت پرستی ونفس پرستی سے دیا۔

اس مقام پر رابطہ عالم اسلامی کے تحقیقی ادارہ "هيئة الاعجاز العلمي للقرآن والسنة" کی جانب اشارہ بھی ضروری ہے، عرصہ سے یہ ادارہ تحقیقی خدمت انجام دے رہا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ قرآن وسنت کے نصوص میں اگر کوئی ایسا مسئلہ ہے جو سائنس کا بھی موضوع ہے، تو دونوں جگہ مسئلہ کا مطالعہ کیا جائے، اور جو نتیجہ اخذ ہو اس کو شائع کیا جائے، اس ادارہ سے اس نوع کی متعدد خدمات سامنے آچکی ہیں۔

کتب حدیث وفقہ کی تبویب پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ احکام شریعت میں کتنی وسعت اور تنوع ہے، اللہ تعالی نے دین اسلام کو جامع بنا کر بھیجا ہے، اور چونکہ یہ دین رہتی دنیا تک کے لئے ہے، اس لئے قیامت تک انسانی معاشرہ میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل اس دین میں موجود رہنا چاہئے، ورنہ اس کے کمال ودوام کا دعوی درست نہ ہوگا، اہل علم جانتے ہیں کہ نصوص کتاب وسنت کی روشنی میں اجماع وقیاس کے ذریعہ انسانی معاشرہ میں ہر دور میں رونما ہونے والے مسائل کا حل تلاش کرنا توفیق الہی سے آسان ہے۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں خورد ونوش کا شعبہ اہمیت کا مالک ہے، حلال کھانے اور حرام سے بچنے کی اسلام میں بڑی تاکید ہے، اور یہ تاکید محض زندگی کو مقید اور تنگ بنانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ غذا سے جو جسم نمو پذیر ہوتا ہے، اور جو عقل وفکر وجود پذیر ہوتی ہے وہ اسی صورت میں پاکیزہ ونافع ہوگی جب جسم اور اس میں موجود دل ودماغ حلال غذا سے نمو پائے، حدیث شریف میں ہے کہ: حرام غذا سے پلنے والے جسم کے لئے جہنم کی آگ ہی مناسب ہے! رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کو محض وعید کی شکل میں نہ دیکھا جائے، بلکہ اس میں تمدن ومعاشرت کے ایک اہم کلیہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

موجودہ معاشرہ میں حرام اشیاء اور غلط طریقوں کے فروغ سے ایک حقیقت پسند انسان کے لئے بڑی دشواری ہے، وہ

یہ نہیں سمجھ پاتا کہ کس طرح اپنا دامن بچا کر اپنی ذمہ داری ادا کرے، مگر یہ مسئلہ گھبراہٹ کا نہیں، مومن کی بصیرت سے کام لینے اور اللہ پر توکل کرنے کا ہے۔ شرعی احکام پر عمل کی راہ میں اگر مشقت کا احساس ہو تو انعزال کی پالیسی کے بجائے معاشرہ میں رہ کر عملی ذمہ داری اور دعوتی فریضہ انجام دینے کی کوشش کرنا چاہئے، اسلام ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ آپ گھٹن کی زندگی بسر کریں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وقت کے دھارے کو موڑنے کی کوشش کریں، اور جس با مقصد دعوت اور پاکیزہ تعلیم کے آپ حامل ہیں اس سے اپنے معاشرہ کو روشناس کرائیں۔

دنیا جس بدامنی، بے چینی، بدچلنی، خوف ودہشت اور تباہی وبربادی کا شکار ہے کیا اس کا یہ سبب نہیں ہوسکتا کہ انسانی معاشرہ نے اللہ تعالی کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کی راہ چھوڑ دی ہے، اب اس کے یہاں نہ دین کا احترام ہے نہ اخلاق کا، نہ عدل واحسان کے اصولوں کی اہمیت ہے نہ اچھے برے کی تمیز، ایک انارکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، اور انسان بے چینی وبدحواسی کے عالم میں اپنا راستہ طے کر رہا ہے! اللہ تعالی نے اپنے رسولوں کو قرآن کریم میں پاکیزہ کھانے اور نیک عمل کرنے کا حکم دیا ہے، کیا اس حکم میں عام انسانیت کے لئے کوئی پیغام نہیں؟ غذا اور جنس کے سلسلہ میں انسان نے جو راہ اختیار کی ہے اس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ اور نہیں!

کسی خوش فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ حالات کے اپنے ناقص مطالعہ کی روشنی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ دور میں تدین کا رجحان بڑھا ہے، لوگ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں مختلف مذاہب اور بالخصوص اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ادیان سماویہ کے مابین تقابل سے متعلق بعض کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور کسی کسی کتاب میں اسلام کے تعلق سے مبنی برانصاف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کتب میں متعدد ایسی کتابیں ہیں جن میں سائنسی نقطۂ نظر سے اسلامی احکام کا جائزہ لیا گیا ہے، اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس دین کے ہر حکم میں انسانی مصلحت کا پہلو موجود ہے، اور چونکہ یہ زمانہ سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کا ہے، اس لئے مذکورہ مباحث میں سائنس دانوں کی تحقیقات کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ ایسا اس لئے نہیں کہ اسلام کو کسی انسانی علم ونظریہ کی تصدیق کی ضرورت ہے، بلکہ اس لئے کہ انسان واقعات وتجربات کے مشاہدہ کے بعد اور قلبی اطمینان حاصل ہونے کے بعد اسلام قبول کرے۔ یقین مانئے، پوری دنیا کی تحقیق اور اس کے تجربات ایک طرف ہوں، اور اسلامی تعلیمات دوسری طرف تو بھی اللہ کے بندے اسلام کی حقانیت کے سلسلہ میں اپنے ایمان ویقین پر قائم رہیں گے، کیونکہ یہ دین اللہ تعالی کا نازل کیا ہوا برحق دین ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جسمانی صحت کے لئے جن دو پہلوؤں کی اہمیت ہے، اسلام

نے ان دونوں پر توجہ مرکوز کی ہے، اور دونوں کی تکمیل کے لئے احکام مقرر کئے ہیں۔

ایک پہلو یہ ہے کہ جو غذائیں جسم کے لئے مفید ہیں ان کے استعمال کا حکم یا اجازت دی ہے، اور بعض غذاؤں کی صراحت کے ساتھ تعریف کی ہے، لہذا جن لوگوں کو جسمانی صحت کی بہتری مطلوب ہے انہیں اس پہلو پر توجہ دینا ضروری ہے۔

دوسرا پہلو مضر غذاؤں اور طریقوں سے بچنے کا ہے، دنیا کی زندگی میں یہ بندوں کی آزمائش اور اللہ کی نعمتوں کے تئیں اس کے جذبہ کا امتحان ہے، بندے کو اگر اپنی صحت عزیز ہوگی تو وہ ضرور ان غذاؤں سے پرہیز کرے گا جو جسم کے لئے مضر ہیں۔ ذیل میں ہم مذکورہ دونوں پہلوؤں کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں:

شہد

غذا کے باب میں شہد کا مقام بلند ہے، انسان قدیم زمانے سے اس کے فوائد سے آشنا ہے، موجودہ دور سائنس وطب کی ترقی کے لئے معروف ہے، اس دور میں شہد سے متعلق تحقیق وتجربہ کا کام ہے، جو لوگ اس میدان میں سرگرم ہیں ان کے بیانات حیرت انگیز ہیں، قرآن کریم کی ایک مختصر سی آیت کریمہ ان تمام تجارب وتحقیقات پر بھاری ہے جو اب تک ہمارے سامنے آچکی ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ اسی آیت کی روشنی میں طب وسائنس کی دنیا اپنی تحقیقات میں روشنی حاصل کرے گی۔

سورۃ النحل کی آیت (۶۹) میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی کے بطن سے مختلف رنگ کا مشروب نکلتا ہے جس میں شفاء ہے۔ آیت میں ''شفاء'' کے لفظ کو عام رکھا گیا ہے، سائنس کی روشنی میں اس آیت کا مقام شاید موجودہ دور سے پہلے واضح نہ رہا ہو، یہ آیت ایک عظیم سائنسی معجزہ ہے، دنیا کے مختلف ممالک واطراف میں یہ خبریں بتواتر پہنچ رہی ہیں کہ بچاؤ اور علاج دونوں مقصد سے متعلق شہد کی تاثیر حیرت انگیز ہے، تجزیہ سے پتہ چلا ہے کہ شہد میں بقدر نصف گلوکوز ہے، اور یہ مقدار کسی اور غذا میں موجود نہیں۔ ڈاکٹر (عبدالعزیز اسماعیل) کا کہنا ہے کہ شہد اکثر امراض میں معالج کا ہتھیار رہے۔

۱۹۵۴ء کے اواخر میں طبی دنیا میں یہ خبر شائع ہوئی کہ امریکہ کی خاتون سائنسداں (جولیا چرسن) نے متعدد تجربوں کے بعد یہ پایا کہ شہد میں اور اس میں موجود موم میں جوڑوں کے تصلب اور تناؤ کو دور کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔

(اللہ والعلم الحدیث ص ۱۹۷)

(جاری)

☆☆☆

تکبر ایک خطرناک بیماری

محمد انور محمد قاسم سلفی/کویت

تکبّر ایک نہایت ہی خطرناک بیماری ہے، اس میں عوام سے زیادہ خواص مبتلا ہیں، عموماً سلاطین، بادشاہ، امراء، وزراء، جاگیردار، زردار اور اونچے عہدوں پر فائز حضرات اس مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں، لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ علماء ومشائخ، صلحاء، عبّاد وزہاد اور اصحاب جبّہ ودستار کا دامن اس سے خالی ہے، بلکہ اس طبقے میں بھی ایسے اصحاب ہیں جن میں سے کسی کو اپنے علم کا، کسی کو اپنے عمل کا، کسی کو اپنی عبادت کا اور کسی کو اپنے زہد وتقوی کا غرور ہے، اور بقول اقبال:

خداوندہ یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

تکبّر کی تعریف:

تکبر بڑائی کو کہتے ہیں، جس کا معنی ہے اپنے آپ کو بڑا اور بلند وبالا تصور کرنا، تکبر میں مبتلا شخص اپنے آپ کو تمام انسانوں میں سب سے بڑا تصور کرتا ہے اور اپنے ابنائے جنس کو حقیر سمجھتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: تکبر تعظّم کو کہتے ہیں، یعنی اپنے آپ کو عظیم سمجھنا، جو انسان اس بیماری میں مبتلا رہتا ہے وہ انسانوں کو ایسی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح کہ بادشاہ اپنے غلاموں کو دیکھتے ہیں۔ (احیاء علوم الدین)

تکبر حرام ہے:

اس کائنات میں کبریائی صرف ایک ہی ایک ہستی کے لئے لائق وزیبا ہے، اور وہ ذات ہے اللہ رب العالمین، احکم الحاکم اور مالک ارض وسما کی، ہر قسم کی بڑائی، کبریائی صرف اسی کے لئے لائق وزیبا ہے، اور یہ صفت بھی ان صفات توحید میں سے ایک ہے جس میں رب العالمین کی ذات میں اور کوئی شریک نہیں ہے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی کے الفاظ ہیں:

" العز إزاري، والكبرياء ردائي فمن ينازعني عذّبته " (مسلم: ۲۶۲۰) عزت میری چادر ہے، اور عظمت میری ازار ہے، جو شخص ان دونوں کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا اسے عذاب دوں گا۔ (مسلم: ۲۶۲۰)

اور اسی لئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

" لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر، فقال رجل: إن الرجل يحب أن يكون ثوبه حسنا ونعله حسنة ؟ قال: إن الله جميل يحب الجمال، الكبر بطر الحق وغمط الناس". (مسلم:۹۱،ترمذی:۱۹۹۹،ابوداود:۴۰۹۱)

''ایسا شخص ہرگز جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا، ایک شخص نے عرض کیا، ہر آدمی کی خواہش رہتی ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: (نہیں اسے تکبر نہیں کہتے، یہ خوبصورتی ہے) بے شک اللہ خوبصورت ہے اور حسن و جمال کو پسند فرماتا ہے، لیکن تکبر حق کو روکنا، اسے اس کے کہنے والے کی طرف پلٹانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔'' (مسلم:۹۱،ترمذی:۱۹۹۹،ابوداود:۴۰۹۱)

تکبر کی حقیقت:

مندرجہ بالا حدیث مبارک میں رسول اکرم ﷺ نے تکبر دو باتوں کو قرار دیا: (۱) حق کو روکنا (۲) انسانوں کو حقیر سمجھنا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حق کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حق وہ ہے جو اللہ تعالی نے اپنے رسول جناب محمد پر نازل فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: ﴿الذين آمنوا وعملوا الصالحات وآمنوا بما نُزّل على محمد وهو الحق من ربهم كفّر عنهم سيئاتهم وأصلح بالهم﴾ (محمد:۲)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیا، اور محمد پر جو نازل کیا گیا اس پر ایمان لائے، اور وہی ان کے رب کا دین برحق ہے، اللہ نے ان کے گناہ مٹا دیئے، اور ان کی حالت کی اصلاح کر دی۔ (محمد:۲)

اور اللہ تعالی نے آپ پر دو چیزیں نازل فرمائی ہیں اور وہ کتاب یعنی قرآن مجید اور حکمت یعنی سنت اور احادیث مبارکہ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ وأنزل الله عليك الكتاب والحكمة وعلّمك ما لم تكن تعلم وكان فضل الله عليك عظيما ﴾

اور اللہ نے آپ پر کتاب وحکمت اتاری ہے اور جو آپ نہیں جانتے تھے وہ آپ کو سکھایا ہے اور آپ پر اللہ کا فضل بڑا تھا۔ (النساء:۱۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ حق، کتاب وسنت ہے، جب کتاب اللہ اور صحیح سنت رسول اللہ سے کوئی حکم سامنے آجائے تو سوائے برضا ورغبت تسلیم کے اور کوئی چارہ کار نہیں، اور اسی میں فلاح وکامیابی ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿إنما كان قول المؤمنين إذا دعوا إلى الله ورسوله ليحكم بينهم أن يقولوا سمعنا وأطعنا وأولئك هم المفلحون﴾ (النور:۵۱)

''مومنوں کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے درمیان فیصلہ کردے، تو کہتے ہیں کہ ہم نے یہ بات سن لی اور اسے مان لیا اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔(النور:۵۱)

نیز یہ بھی فرمادیا گیا ہے کہ مومنوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کے آگے چوں چرا کی بھی گنجائش نہیں ہے۔

﴿ وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمرا أن يكون لهم الخيرة من أمرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا ﴾۔ (احزاب:۳۶)

اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کردے تو کسی مومن مرد اور عورت کے لئے اس بارے میں کوئی اور فیصلہ قبول کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوجائے گا۔(احزاب:۳۶)

نیز فرمایا گیا کہ آپس کے اختلافی امور میں جب تک رسول اکرم کے فیصلے کو دل وجان سے برضا ورغبت قبول نہ کرلیں، اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے، ارشاد باری ہے:

﴿ فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما ﴾ (النساء:۶۵) ترجمہ:''پس آپ کے رب کی قسم! وہ لوگ مومن نہیں ہوسکتے جب تک آپ کو اپنے اختلافی امور میں اپنا فیصل نہ مان لیں، پھر آپ کے فیصلوں کے بارے میں اپنے دل میں کوئی گھٹن محسوس نہ کریں اور پورے طور سے اسے تسلیم کرلیں''۔

اللہ تعالی نے آپ ﷺ کی سنتوں کو شیوہ بنا لینے کا حکم دے کر آپ کی مخالفت پر سخت وعید اور عذاب الیم کا وعدہ فرمایا ہے:

ارشاد ربانی ہے: ﴿فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب أليم﴾ (النور:۶۳)

ترجمہ: ان (رسول اکرم ﷺ) کے احکام کی مخالفت کرنے والوں کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں ان کو کوئی آزمائش یا دردناک عذاب لاحق ہو۔

سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:''ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی مجلس مبارک میں (داہنا ہاتھ سلامت رہنے کے باوجود) بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: اپنے داہنے ہاتھ سے کھاؤ، اس نے کہا: میں داہنے ہاتھ سے کھانے کی قدرت نہیں رکھتا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اب آئندہ تو کبھی کھا بھی نہیں سکے گا۔(تو فوراً اللہ نے

اس کے ہاتھ پر شل گرادیا) اور وہ پھر کبھی اپنا ہاتھ اپنے منہ تک نہیں اٹھا سکا، اسے رسول اکرم ﷺ کی بات ماننے سے سوائے تکبر کے اور کسی چیز نے نہیں روکا تھا۔ (مسلم: ۲۰۲۱)

تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت اور معصیت سے اجتناب تواضع ہے اور اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت اور نافرمانی تکبر ہے۔

تکبر کی قسمیں:

تکبر کی تین قسمیں ہیں: (۱) اللہ تعالی پر تکبر (۲) اللہ کے رسولوں پر تکبر (۳) انسانوں پر تکبر۔

(۱) اللہ کی ذات پر تکبر: دنیا میں کچھ ایسے سر پھرے بھی گذرے ہیں جنہوں نے اللہ کی ذات پر تکبر کیا، ان میں سے ایک، خاندان اشوریہ سے تعلق رکھنے والا، بابل (عراق) کا بادشاہ نمبرود بن کنعان تھا، اس نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ کون ہے تمہارا رب جس کی طرف ہمیں بلاتے ہو؟ اور وہ ایک مدت مدید تک بادشاہت کرنے کی وجہ سے کبر وغرور میں مبتلا ہوگیا تھا، اور شیطان نے اس کے دماغ میں یہ احمقانہ خیال بٹھا دیا تھا کہ وہی رب العالمین ہے، اسی لئے جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، تو اس دل کے اندھے نے کہا کہ میں بھی تو زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، ابن عباس ؓ کی روایت ہے کہ اس نے اسی مجلس میں دو قیدی منگوائے، ایک کو قتل کردیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا، حالانکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مقصد واضح تھا کہ اللہ تعالی انسانوں کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور پھر انہیں وجود سے عدم کی طرف لے جاتا ہے، لیکن جب یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اچھا تو اللہ تعالی آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا، تو وہ مبہوت اور عاجز ہوگیا، اور ظالموں کے پاس کبھی بھی حجت ودلیل نہیں ہوتی۔

اسی کے متعلق فرمان باری ہے: ﴿ألم تر إلى الذي حاج إبراهيم في ربه أن آتاه الله الملك إذ قال إبراهيم ربي الذى يحيي ويميت قال أنا أحيي وأميت قال إبراهيم فإن الله يأتي بالشمس من المشرق فأت بها من المغرب فبُهت الذي كفر والله لا يهدي القوم الظالمين﴾ (البقرۃ: ۲۵۸)

تفاسیر میں آتا ہے کہ اللہ تعالی نے ایک مچھر اس شخص کے دماغ میں پیدا کردیا، جو اس کے دماغ کو آہستہ آہستہ چاٹنے لگا، جس کی تکلیف سے وہ پاگلوں کی طرح چیختا اور دھاڑیں مار مار کر روتا، اس طرح تقریبا چالیس سال مبتلائے عذاب رکھ کر روئے زمین پر خدائی کا دعوی کرنے والے اس متکبر سے، مالک حقیقی نے اپنا انتقام لیا۔

اور دوسرا وہ متکبر جس نے روئے زمین پر اپنی خدائی کا اعلان کیا تھا، وہ مصر کے سلسلۂ فراعنہ کا ''منفتاح'' نامی بادشاہ

تھا، جس نے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ''رعمسیس ثانی'' کا لقب اختیار کیا تھا، اور جس نے ﴿أنا ربكم الأعلى﴾ (میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں) کا نعرہ لگایا اور جس نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے نہایت ہی تکبر سے کہا:

﴿ونادى فرعون في قومه قال يا قوم أليس لي ملك مصر وهذه الأنهار تجري من تحتي أفلا تبصرون، أم أنا خير من هذا الذي هو مهين ولا يكاد يبين، فلولا ألقي عليه أسورة من ذهب أو جاء معه الملائكة مقترنين، فاستخف قومه فأطاعوه إنهم كانوا قوما فاسقين، فلما آسفونا انتقمنا منهم فأغرقناهم أجمعين، فجعلناهم سلفا ومثلا للآخرين﴾ (زخرف:۵۱-۵۶)

فرعون نے اپنی قوم کو پکار کر کہا: اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں؟ اور یہ نہریں جو میرے محلوں کے نیچے سے جاری ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ بلکہ میں بہتر ہوں اس (موسیٰ) سے جو (معاذ اللہ) ایک ذلیل آدمی ہے، اور قوت بیان سے بھی تقریباً محروم ہے، پھر اس کے لئے سونے کے کنگن کیوں نہیں اتارے گئے ہیں، یا اس کے ساتھ پر باندھے فرشتے کیوں نہیں آئے ہیں؟ پس اس نے اپنی قوم کو بے وقوف بنایا، چنانچہ انہوں نے اس کی بات مان لی، بے شک وہ نافرمان تھے، جب فرعون کا کبر وغرور انتہا کو پہنچ گیا تو رب العالمین نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ چھ لاکھ بیس ہزار بنواسرائیل کے ساتھ راتوں رات مصر سے نکل جائیں، جب فرعون کو بنواسرائیل کے اس فرار کی خبر ملی تو فوراً پچیس لاکھ کا ایک لشکر جرار لیکر ان کے تعاقب میں نکل پڑا، جب بنواسرائیل نے ساری رات چل کر صبح کیا تو دیکھا کہ سامنے بحر احمر (ٹھاٹھیں) مار رہا ہے، تو دور سے فرعون کا لشکر جرار بھی پہنچنا ہی چاہتا ہے، ایسے وقت سیدنا موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا کی، تو اللہ نے حکم دیا کہ آپ سمندر میں لاٹھی ماریں تو سمندر میں راستہ بن جائے گا، آپ نے بارہ مختلف جگہوں پر لاٹھی ماراتو سمندر پھٹ گیا، راستہ خشک ہوگیا، اور پانی دیوار کے مانند کھڑا ہوگیا، جب بنواسرائیل درمیان میں پہنچے تو فرعون کا لشکر سمندر کے قریب پہنچا، فرعون نے چلا کر کہا: دیکھتے کیا ہو، سمندر میں تم بھی داخل ہو جاؤ، جب بنواسرائیل کنارے پہنچ گئے تو فرعون کا لشکر سمندر کے بیچوں بیچ پہنچ گیا، تو پھر رب العالمین نے اپنے اس دشمن سے اس طرح انتقام لیا کہ سمندر کو حکم دیا کہ وہ آپس میں مل جائے، جونہی ایسا ہوا، اور سمندر کا کھارا پانی اللہ کا عذاب بن کر اس کے منہ میں داخل ہوا، تو تکبر وغرور کا یہ پتلا، زمین کی خدائی کا دعویدار، اپنی ساری خدائی بھول کر، اس رب لم یزل ولا یزال، جس کی بادشاہت کو کبھی زوال نہیں، کی دہائی دینے لگا کہ میں اسی کا بندہ ہوں اور اسی پر ایمان رکھتا ہوں، لیکن یہ دستور الٰہی ہے کہ عذاب کے نازل ہونے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، چنانچہ فرمان صادر ہوا کہ جناب! اب تمہارے ہوش ٹھکانے پر آئے، لیکن آج تمہیں نجات نہیں، بقول قرآن:

﴿ وجاوزنا ببني إسرائيل البحر فأتبعهم فرعون وجنوده بغيا وعدوا حتى إذا أدركه الغرق قال آمنت أنه لا إله إلا الذي آمنت به بنو إسرائيل وأنا من المسلمين، الآن وقد عصيت قبلُ وكنتَ من المفسدين، فاليومَ ننجّيك ببدنك لتكون لمن خلفك آية وإن كثيرا من الناس عن آياتنا لغافلون ﴾ (یونس:۹۰-۹۲)

اور ہم نے بنو اسرائیل کو سمندر پار کرادیا، تو فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی میں آکر اور حد سے تجاوز کرتے ہوئے ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو کہا: میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے، اور میں اب فرماں برداروں میں سے ہوں، کیا اب ایمان لائے ہو اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتے رہے اور فساد کرنے والوں میں سے تھے، تو آج ہم تیرے جسم کو پانی سے نکال لیں گے تاکہ تو اپنے بعد آنے والوں کے لئے نشان عبرت بن جائے، اور بہت سے لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہوتے ہیں۔ (یونس:۹۰-۹۲)

چنانچہ اس کی لاش کو نہ پانی نے قبول کیا اور نہ ہی زمین نے، اللہ تعالی اس کی لاش کو بچا کر رکھا اور آج بھی مصر کے دار الحکومت قاہرہ کے میوزیم میں اس کی لاش موجود ہے، اور زمین کے خداؤں اور تخت وتاج کے متکبروں کے لئے نشان عبرت بنی ہوئی ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے: دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

(۲) انبیاء علیہم السلام کی ذات پر تکبر: اس کا انجام بھی دنیا میں تباہی اور آخرت میں روسیاہی ہے، انبیاء علیہم السلام کی ذات پر تکبر کرنے والی قوموں اور شخصوں کی فہرست بڑی طویل ہے، مختصر یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے لے کر ہمارے رسول محمد کریم ﷺ تک، جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا، ان سے دشمنی کی اور ان کی مقدس ذات پر تکبر کیا، تو اللہ تعالی نے اپنے بھیانک عذاب سے انہیں تباہ وبرباد کردیا اور اس کی تفصیل سے سارا قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔

(۳) انسانوں پر تکبر کرنا غضب الٰہی کو دعوت دینا ہے، جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں تمہیں اہل دوزخ کے متعلق خبر نہ دوں؟ ہر وہ شخص جو سرکش، بدمست اور متکبر ہے، دوزخی ہے۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ نے لوگوں کو بدترین قرار دیا جو اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھتے ہیں، فرمان نبوی ﷺ ہے:

کسی آدمی کے برے ہونے کے لئے یہی چیز کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر جانے، ہر مسلمان پر اپنے دیگر اسلامی برادر کا خون، مال اور آبرو حرام ہے۔ (مسلم:۲۵۶۴)

☆☆☆

تعلیمی اور سیاسی بیداری

مولانا محمد مظہر الاعظمی
استاذ جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

ہم سب کا پختہ ایمان وایقان ہے کہ قرآن کریم کلام الٰہی ہے جس کا ایک ایک حرف صحیح اور درست ہے نیز اس کے تمام اوامر ونواہی انسان کی عین فطرت کے مطابق ہیں، لہذا اس روشنی میں جب ہم قرآن کریم کی یہ آیت پڑھتے ہیں کہ ﴿ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين ولكن المنافقين لا يعلمون﴾ (سورۃ المنافقون: ۸) کہ سنو! عزت تو صرف اللہ کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے ہے اور ایمانداروں کے لئے ہے لیکن یہ منافق جانتے نہیں تو ہم کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں اور مخمصے میں پڑ جاتے ہیں کہ قرآن جس کا حرف حرف منزل من اللہ اس کا تو دعوی ہے کہ عزت اللہ، اس کے رسول ﷺ اور مومنوں کے لئے ہے مگر قرآن کے اس دعوی اور عصر حاضر کے مسلمانوں کے حالات میں بظاہر کسی طرح مطابقت نہیں ہے بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، پوری دنیا میں مسلمان کا حال حد درجہ ناگفتہ بہ ہے، ذلت اس کا مقدر بن چکی ہے، دنیا کی بدترین اور ذلیل قومیں بھی مسلمانوں کو ذلت بھری نظروں سے دیکھتی ہیں، عزت ووقار جو مسلمانوں کا سرمایہ حیات تھا اس پر دوسری قومیں قابض ہیں اور صرف قابض ہی نہیں بلکہ اسے اپنا آبائی اور مذہبی حق سمجھتی ہیں۔

۱- سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ ہماری عزت وناموس پر زوال کیوں آیا اور دوسری قومیں اس پر کیوں غالب وقابض ہوگئیں، وہ کیا خامیاں ہیں جو ہم میں پیدا ہوئیں اور ہماری صورت حال میں یہ تبدیلی پیدا ہوئی کیونکہ قرآن کریم نے جہاں مسلمانوں کے لئے عزت ووقار کا دعوی کیا ہے وہیں یہ بھی کہا ہے کہ ﴿ان الله لا يغير ما بقوم حتى يغيروا ما بأنفسهم﴾ (سورہ رعد: ۱۱) یعنی کسی قوم کی حالت اللہ تعالی نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اسے نہ بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے، جس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خامیاں خود ہمارے اندر ہیں جس کے احتساب کی ضرورت ہے اور ایمانداری کے ساتھ احتساب کے بعد ہی خامیوں کا صحیح علاج اور مداوی ہوسکتا ہے۔

سورہ منافقون کی جس آیت کی روشنی میں میں نے بتایا کہ عزت اللہ کے لئے، اس کے رسول کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے، اس کے بعد کی آیت میں ارشاد ہوا کہ ﴿يا أيها الذين آمنوا لا تلهكم أموالكم ولا أولادكم عن ذكر

الله ومن يفعل ذلك فأولئك هم الخاسرون﴾ (سورۃ المنافقون:۹) اے مسلمانو! تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں اور جو ایسا کریں وہ بڑے ہی زیاں کار لوگ ہیں۔

معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے پاس دولت وثروت بھی ہوگی اور اولاد بھی مگر یہ چیزیں اسے اللہ سے غافل کردیں گی جس کے بعد صورت حال وہی ہوگی جو اس وقت ہے، کیونکہ اس وقت مسلمانوں کے پاس دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ سیم وزر اور تیل کی دولت ہے نیز تعداد کے حساب سے بھی مسلمان کسی سے کم نہیں، اس کے باوجود ذلت وخواری کا تاج اپنے سروں پر سجائے گھوم رہے ہیں، کبھی افغانستان پر حملہ ہوتا ہے اور کبھی عراق پر اور کبھی گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی ہوتی ہے جسے دنیا سن رہی ہے اور دیکھ رہی ہے مگر مسلمان نہ اپنے حالات میں تبدیلی کے لئے آمادہ ہیں اور نہ ہی حقوق انسانیت کے علم برداروں کو یہ سب کچھ انسانیت کے خلاف معلوم ہوتا جس پر وہ چیں بجبیں ہوں۔

مسلمان جب اللہ کے ذکر سے غفلت کرتا ہے تو ہر ایک میدان میں پچھڑ جاتا ہے اور اس وقت مسلمان ہر ایک میدان میں پچھڑا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کے اسباب ایک دو نہیں بلکہ ڈھیر سارے ہیں ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

تعلیم اور سیاست کے میدان میں مسلمانوں کی جو خامیاں اور کمزوریاں ہیں انہیں اجاگر کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے اسباب کیا ہیں؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس وقت ہندوستانی مسلمان بری طرح احساس کمتری کا شکار ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین کی طرف یہ بات بار بار دہرائی جارہی ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہیں جس کی وجہ سے ان کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے اور ان کا وہ حق جو ہندوستان کے باشندہ ہونے کی وجہ سے مساوات کے ساتھ ملنا چاہئے نہیں مل رہا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اقلیت میں ہونا ہی حق تلفی کا بنیادی سبب ہے اور تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہے، یہ احساس بہت سے طلبہ کو آگے بڑھنے سے پہلے ہی روک دیتا ہے اور وہ تعلیم ترک کردیتے ہیں کہ اقلیت کے ساتھ ناانصافی آگے نہیں بڑھنے دے گی، اس لئے اس وقت مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ انہیں احساس اقلیت کے حوصلہ شکن فریب سے بچایا جانے اور اقلیت میں رہ کر ایک باعزت اور باوقار کی طرح جینے اور اپنی تابناک تاریخ دہرانے کا حوصلہ دیا جائے، کیونکہ حوصلہ شکن حالات نے مسلمانوں کے فکری دھارے کا رخ اس طرح موڑ دیا ہے کہ اب انہیں دور سے دور تک کہیں زندگی کی رمق دکھلائی نہیں دیتی بلکہ یہی صورت حال باقی رہی تو مسلمان اپنا وجود سپر

پاور کا مرہون منت سمجھ لیں گے۔

اس قدر سنگین حالات سے نبرد آزما ہو کر قوم کا رخ تعلیم کی طرف موڑنا اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لئے صرف بحر افکار میں غوطہ زن ہونا کافی نہیں بلکہ میدان عمل کی پر خار اور سنگلاخ وادی کو طے کرنا ہوگا، جو مسلمان جیسی حوصلہ مند قوم کے لئے مشکل نہیں، اگر وہ خود کو پہچانے اور اقدام وعمل کا عزم مصمم کرے۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

ہمارا اس بات پر مکمل اور پختہ ایمان وایقان ہے کہ اسلام میں نہ تعداد کو حیثیت ہے اور نہ ہی اقلیت واکثریت معیار امتیاز، اللہ تعالی فرماتا ہے کہ: ﴿کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة بإذن الله﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۴۹) بلکہ معیار ایمانی قوت ہے جو غیر مرئی تو ضرور ہے مگر اس غیر مرئی قوت کا مقابلہ مادی اور مرئی طاقت وقوت سے ممکن نہیں، جس پر عہد رسول اللہ ﷺ کے غزوات شاہد عدل ہیں، نیز ہندوستان کی سات آٹھ سو سال پر مشتمل طویل تاریخ کا ورق ورق گواہ ہے کہ اس عرصہ میں مسلمان کبھی اکثریت میں نہ رہے بلکہ اقلیت میں ہونے کے باوجود ایسی تاریخ رقم کی کہ تاریخ کے خلاف مسلسل ریشہ دوانیوں کے باوجود آج بھی جامع مسجد دہلی کے گنگورے، قطب مینار کی بلندی، لال قلعہ کی وسعت وپختگی اور تاج محل کا حسن وجمال عظمت رفتہ کی داستان پارینہ زبان حال سے سنا رہے ہیں۔

اگر ہمارے اسلاف اقلیت میں ہو کر اپنی سنہری تاریخ رقم کر سکتے ہیں، تو آج ہماری اقلیت ہمیں اپنی تابناک تاریخ رقم کرنے سے کیوں مانع ہے؟ اگر ہم دیانتداری کے ساتھ اس کا تجزیہ کریں تو بے لاگ یہ کہنا پڑے گا کہ ''اقلیت کا فریب اور احساس کمتری'' کیونکہ اس وقت بھی جو قومیں تعداد میں کم ہیں مگر اقلیت کے فریب اور احساس کمتری کا شکار نہیں، وہ پوری دنیا کو اپنے چشم وابرو کے اشارہ پر کنیز زرخرید کی طرح رقص کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

اس وقت پوری دنیا میں یہودی صرف ڈیڑھ کروڑ ہیں جو مسلمانوں کی آبادی کا ایک فیصد سے کچھ زائد ہے اور پوری دنیا کی آبادی کا صرف 1/0 فیصد، اس کے باوجود دنیا کی معیشت اور سیاست پر مکمل قابض ہیں، کیونکہ نہ وہ اقلیت کے فریب میں ہیں اور نہ ہی احساس کمتری کا شکار، وہ اپنی ناکامی کے لئے مسلمانوں کی طرف دوسری اقوام کی طرح شکوہ بھی نہیں کرتے بلکہ حصول مقصد میں اپنی پوری صلاحیت صرف کر دیتے ہیں، جس کی مثال ایک تازہ رپورٹ ہے کہ یہودی بچے اٹھارہ گھنٹہ پڑھتے ہیں، جس کی وجہ سے ہر سال کچھ بچے پاگل ہو جاتے ہیں، جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے بچے نہ پڑھ کر پاگل رہ جاتے ہیں۔

امریکہ میں یہودیوں کے اقلیتی ادارے بھی ہیں، جن میں دوسرے مذاہب کے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان اقلیتی اداروں میں یہودیوں کا یہ اصول ہے کہ دوسرے مذاہب کے بچوں کو صرف چالیس فیصد نمبر حاصل کرنے پر وظیفہ کا مستحق

قرار دیتے ہیں، جبکہ اپنے بچوں کو پچہتر فیصد نمبر حاصل کرنے پر وظیفہ کا اہل مانتے ہیں، اس وقت مسلمانوں کی جو سوچ ہے اس کے لحاظ سے یہ معاملہ بالکل الٹا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہودیوں کی کامیابی اسی میں مضمر ہے، وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے بچے کم ہی نمبر پر وظیفہ پاکر مگن ہو جائیں اور زیادہ محنت کرنے کے عادی نہ بنیں، اور ہمارے بچے پچہتر فیصد نمبر حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کے خوگر بن جائیں، تاکہ پڑھنے کے بعد اپنی محنت اور جفاکشی کی وجہ سے ہر میدان میں کامیاب رہیں، کیونکہ وہ اقلیت کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ کامیابی کا راز محنت ولگن میں پوشیدہ سمجھتے ہیں جس کا ثمرہ دنیا کے سامنے ہے۔

اس وقت مسلمانوں کا قدرے تعلیم کی طرف رجحان ہوا ہے مگر محنت کرنے سے بچے اعراض کرتے ہیں اور ایسے مضامین لے کر گریجویشن کرتے ہیں جس میں کم سے کم محنت کرنا پڑے اور ڈگری مل جائے، بیشتر والدین بھی نہیں جانتے کہ ہمارا لڑکا کیا پڑھ رہا ہے اور اس کا ثمرہ اور مستقبل کیا ہے؟

ابھی حال کی بات ہے جب گورنمنٹ نے مدارس وجامعات میں سائنس ٹیچر رکھنے کا نظم کیا تو بی ایس سی اور ایم ایس سی چراغ لیکر تلاش کئے جانے لگے، اور جو بھی ملا اس کو بحیثیت استاذ مدرسہ میں رکھ لیا گیا، اس کے بعد بھی اس فن کے جاننے والے مطلوب ہیں کیونکہ بڑی قلت ہے۔

اسی طرح اردو سے بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے والے روڈ پر ٹہلتے ہوئے ڈھیر سارے ملیں گے مگر انگریزی میں بی اے اور ایم اے کرنے والے تلاش کرنے پر بھی مشکل ہی سے مل پاتے ہیں، جہاں تک میں نے تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بچے مضامین کا انتخاب خود کرتے ہیں جس میں سہل پسندی کارفرما ہوتی ہے، والدین صرف اس بات پر مگن ہوتے ہیں کہ لڑکا بی اے اور ایم اے کر رہا ہے، کس زبان سے کر رہا ہے، اس کی معاشرہ کو کیا ضرورت ہے اور اس کا کیا مستقبل ہے؟ وہ یہ نہیں جانتے۔

ایک اسکول کے ایک استاذ نے مجھے بتایا کہ اسکول میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اساتذہ ایسے مضامین لینے پر زور دیتے ہیں جس میں وہ آسانی سے پاس ہوسکیں اور اسکول کا اچھا ریزلٹ آئے، اگرچہ اس کا کوئی مستقبل نہ ہو۔

عصر حاضر کے تقاضے کے مطابق جو سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف تعلیم پر نہیں بلکہ ان فنون کی تعلیم پر زور دیا جائے، جس کی زیادہ ضرورت ہے۔

ہمارا شہر مئوناتھ بھنجن جہاں دینی اور عصری بہت سے ادارے ہیں، ان اداروں نے علماء اور حفاظ سے مئو کو خود کفیل کر دیا ہے، بلکہ صرف خود کفیل ہی نہیں کیا، دوسرے بہت سے شہروں کو علماء اور حفاظ مہیا بھی کرتے ہیں، ہر سال رمضان المبارک کے

مقدس مہینہ میں سیکڑوں کی تعداد میں حفاظ کرام بڑے بڑے شہروں میں جا کر قرآن سناتے ہیں، مگر اچھے ڈاکٹروں کا اب بھی بہت اہم مسئلہ ہے، کسی بھی پیچیدہ اور خطرناک مرض کے لئے بنارس اور لکھنؤ کا ہی رخ کرنا پڑتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ اس فن کی طرف توجہ کا کم ہونا ہے۔

اس مناسبت سے میں ایک بات بڑے ہی ادب اور معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں جو بڑی تلخ ہے مگر مبنی برحقیقت ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے اداروں میں پوری توجہ تعمیر اور بلڈنگ پر دی جاتی ہے اور عوام وخواص اسی کو ادارے کی ترقی سمجھتے ہیں، تعمیری ترقی کے بعد تعداد اور کوانٹیٹی پر صلاحیت مرکوز رکھی جاتی ہے مگر کوالیٹی کے بارے میں سوچنے والے بہت کم ملیں گے جن کے سامنے یہ مسئلہ ہوتا کہ تعلیم اچھی سے اچھی ہو اور بچے اچھے سے اچھے نکلیں۔

یہ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنا چاہئے کہ عصر حاضر مسابقہ، مقابلہ اور کمپیٹیشن کا دور ہے جس میں کوانٹیٹی نہیں کوالیٹی مطلوب ہوتی ہے اور دیکھی جاتی ہے، اگر کسی ادارہ سے ایک لڑکا نکلا مگر باصلاحیت ہے تو وہ مسابقہ کے میدان میں اپنا لوہا منوالے گا، مگر اس کے برخلاف اگر تعداد سیکڑوں کی ہو مگر صلاحیت نہ ہو تو پوری کی پوری تعداد مسابقہ کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ جائے گی، اس لئے تعلیم پر توجہ دینے کے ساتھ معیار تعلیم پر توجہ کی زیادہ ضرورت ہے، مگر افسوس کہ مدارس وجامعات اور اسکول وکالج تو بڑی کثرت سے بڑھ رہے ہیں مگر مطلوبہ صلاحیت اور کوالیٹی نہیں ملتی جس کی ضرورت ہے، نتیجۃً تھوڑی دور چلنے کے بعد راستہ بند ہو جاتا ہے اور پھر ایک اسٹوڈنٹ اقلیت کے ساتھ ناانصافی کا شکوہ کر کے تعلیم ترک کر کے بیٹھ جاتا ہے حالانکہ رکاوٹ اقلیت کے ساتھ ناانصافی نہیں بلکہ خود اس کی اپنی صلاحیت ہوتی ہے، اس لئے کامیابی کے لئے صرف تعلیمی بیداری کافی نہیں بلکہ تعلیمی معیار ضروری ہے، بصورت دیگر ہم تعلیمی بیداری پیدا کر کے بھی منزل تک پہنچنے سے قاصر ہوں گے اور منزل مقصود تک نہ پہنچنے پر اپنی خامی نہیں بلکہ غیروں کی ظلم وزیادتی کو وجہ قرار دیں گے، جو ایک زندہ اور حوصلہ مند قوم کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے۔

تعلیمی بیداری کے سلسلہ میں ایک بات اور ذکر کرنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر سال خصوصا جولائی میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لئے ریلیاں نکالی جاتی ہیں اور عوام وخواص کو ورغلایا جاتا ہے کہ اپنے بچوں کو تعلیمی اداروں میں بھیجیں جو ایک اچھا قدم ہے مگر اس سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بچوں کا پتہ لگایا جائے جو خود پڑھنا چاہتے ہیں، والدین بھی پڑھانا چاہتے ہیں، مگر گھر کے معاشی حالات اس قدر خراب ہیں کہ چاہ کر بھی نہ بچہ پڑھ پاتا اور نہ ہی والدین پڑھا پاتے۔

گزشتہ سال تعلیمی بیداری کے لئے ہمارے مئو ناتھ بھنجن میں کوشش ہوئی، بچوں اور والدین سے لوگ ملے مگر جہاں بچوں کے لئے کتاب کاپی قلم اور بستے کا مسئلہ کھڑا ہوا، اس کا کوئی حل نہ نکلنے کی وجہ سے اس کوشش کا کوئی خاطر خواہ ثمرہ مرتب

نہیں ہوا، حالانکہ ہماری تاریخ بھری پڑی ہے کہ بہت سے غریب بچے جو بلا کے ذہین تھے ان کو جب تھوڑا سا سہارا ملا تو انہوں نے اپنی صلاحیت سے کارہائے نمایاں انجام دیا اور قوم وملت کا کام کرکے نام بھی روشن کیا۔

میرے مقالہ کا دوسرا جزء ہے ''سیاسی بیداری''، اس جزء سے متعلق مختصراعرض ہے کہ موجودہ سیاست کے بارے میں مسلمان دوحصوں میں منقسم ہیں، ایک تو وہ طبقہ ہے جو موجودہ سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اس کے قریب جانا گناہ کبیرہ سمجھتا ہے جبکہ اس طبقہ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے جہاں ہماری آواز ایوانوں تک اسی صورت میں پہنچ سکتی ہے جب ہمارے نمائندے ایوانوں تک پہنچیں، بصورت دیگر نہ ہماری کوئی آواز ہوگی اور نہ ہی آواز کا سننے والا، اس لئے سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھ کر اگر ہم نے چھوڑ دیا اور قوم کی صحیح قیادت نہ کی تو یقیناً یہ ہمارے لئے بڑی بدقسمتی ہوگی کیونکہ ۔

جداہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ حقیقت ہے کہ سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھنے والا طبقہ بلاوجہ اس سے دور نہیں رہنا چاہتا بلکہ اسے معلوم ہے کہ موجودہ سیاست اور اس میں جانے والوں کی مثال ''ہر کہ درکان نمم رفت نمک شد'' کی طرح ہے، لیکن کیا امت کے اس طبقہ کو یہ نہیں معلوم کہ امت مسلمہ اس لئے نہیں برپا کی گئی ہے کہ سیلاب کی طرح رو میں بہہ جائے بلکہ امت مسلمہ تو اس لئے وجود میں آئی ہے کہ ۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اس لئے مسئلہ کا حل یہ نہیں کہ ہم شجر ممنوعہ سمجھ کر اس سے پرہیز کریں بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ اس کے رخ کو موڑیں جس طرح انبیاء اور رسول آتے اور اپنے زمانے کے رخ کو بدل دیا کرتے تھے، اگر عزم محکم ہو تو یہ مشکل نہیں ہے ۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

دوسرا طبقہ وہ ہے جو سیاست میں جا کر اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے بلکہ دو قدم آگے ہی رہتا ہے، موجودہ سیاست کا رنگ ایک بین الاقوامی سیاسی لیڈر کے الفاظ میں سنئے، وہ کہتا ہے کہ:

The policticians are same alloxer, they promiss to build a bridge even where there no river.

یعنی سیاسی حضرات ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں وہ وہاں بھی پل بنانے کا وعدہ کر دیتے ہیں جہاں دریا بھی نہیں ہے۔

موجودہ سیاست میں جا کر اسی رنگ کو اختیار کرنے والا طبقہ خود کو قوم کا خادم، اور بہی خواہ ضرور سمجھتا اور کہتا ہے مگر وہ سیاست کو تجارت سمجھ کر جاتا ہے، اس لئے وہ قوم کی خدمت کے نام پر قوم کا استحصال کرتا ہے، یہ کسی سے مخفی و پوشیدہ نہیں کہ ایک ایم ایل اے اور ایم پی الکشن جیتنے کے لئے کس طرح کروڑوں روپئے خرچ کرتا ہے، کیا وہ قوم کی خدمت کے لئے صرف

کرتا ہے؟ نہیں بلکہ اس کے سامنے ایک ٹارگیٹ ہوتا ہے جسے حاصل کرنا اور پانا مقصود ہوتا ہے، جبکہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک شخص اپنی اور قوم کی خدمت بیک وقت نہیں کرسکتا۔

You can not serve both self and country.

یعنی تم اپنی اور اپنے ملک کی خدمت ایک ساتھ نہیں کرسکتے۔

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ سید القوم خادمھم یعنی قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے۔ اس لئے سیاسی قائدین کو چاہئے کہ خود کو قوم کا خادم کہنے کے ساتھ اسے عملی جامہ بھی پہنائیں جیسا کہ خلفاء راشدین اور بعد کے ادوار میں مسلم حکمرانوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح شب بیداری کرکے حاجتمندوں کی حاجت، ضرورت معلوم کرکے ان کی ضرورت پوری کرتے تھے، اور ایسا اسی وقت ممکن ہے جب سیاست کو نہ تو شجر ممنوعہ سمجھا جائے اور نہ ہی تجارت، اگر اتنی بیداری ہم میں پیدا ہوجائے تو پھر ہماری قیادت کا مسئلہ حل ہوجائے گا اور اس مسئلہ کو حل کئے بغیر ہم پسماندگی کو دور کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتے۔

صحیح قیادت کے فقدان کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان بجائے مثبت ووٹ دینے کے منفی ووٹ دے رہا ہے، جو بذات خود ایک مسئلہ ہے نیز اس منفی ووٹ کی نہ کوئی قیمت ہوتی اور نہ ہی وزن۔

منفی ووٹ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی پارٹی اور اس کے لیڈر کو ووٹ صرف اس لئے دیتا ہے کہ وہ اپنے مدمقابل کو ہرائے جیسا کہ عام طور پر مسلمان اس پارٹی کو ووٹ دیتا ہے جو بی جے پی کو شکست دے، جس کا ثمرہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ ہارنے والا تو ہم کو اپنا دشمن سمجھتا ہی ہے جیتنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے ووٹ جیتنے کے لئے نہیں بلکہ مدمقابل کو ہرانے کے لئے مجبوراً دیا گیا ہے یعنی لا لحب علي بل لبغض معاوية۔

اس وقت مسلمان جن پارٹیوں کو ووٹ دیتا ہے وہ پارٹیاں اچھی طرح جانتی ہیں کہ مسلمان اپنا منفی ووٹ صرف مجبوری میں دے رہے ہیں جس کی وجہ سے ووٹ پانے اور جیتنے کے باوجود بھی مسلمانوں کا کام نہیں ہوتا، اس لئے اب مسلمانوں کو بجائے منفی ووٹ دینے کے مثبت ووٹ دینا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی اپنی مستحکم اور مضبوط قیادت ہو۔

ہمارے عقیدہ کے مطابق اب کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا جو قیادت کی ذمہ داری سنبھالے گا بلکہ اسی انسانی بھیڑ سے کوئی قائد پیدا ہوگا جو بہرحال معصوم عن الخطأ نہیں ہوگا، اس لئے اگر ایک طرف عوام کی ذمہ داری ہے کہ اسے اپنا قائد تسلیم کریں وہیں اس کی بھی ذمہ داری ہے کہ عوام کی صحیح قیادت کرے اور صحیح سمت میں رہنمائی کرے۔

☆☆☆

بانیان ومنتظمین
مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ، دہلی

(قسط:۱) مولانا اسعد اعظمی/استاذ جامعہ سلفیہ

مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی (۱۹۲۱-۱۹۴۷ء) جماعت اہل حدیث کا ایک مشہور، معتبر اور مضبوط ادارہ تھا جو اپنی معیاری تعلیم وتربیت کے لئے آج بھی یاد کیا جاتا ہے، یہ ادارہ اپنی زمین، عمارت اور جملہ اخراجات کے اعتبار سے شخصی تھا، اس کے بانی ومہتمم حضرات نے اس مدرسہ کے قیام سے ایک تاریخ رقم کی تھی، انہوں نے علم دوستی، علماء نوازی اور علم دین کی خدمت کے ایسے نمونے چھوڑے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے سراپا درس عبرت ہیں۔

زیر نظر مضمون میں ان ہی نفوس عظیمہ کے کچھ احوال ومعمولات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اندازہ لگایا جاسکے کہ اس عظیم الشان تاریخی ادارے کی کامیابی اور ناموری کے پیچھے اس کے منتظمین کے خلوص اور ایثار وقربانی کا کس قدر حصہ رہا، ان شاء اللہ آئندہ شماروں میں مدرسہ کی مفصل تاریخ بھی پیش کی جائے گی۔

واضح رہے کہ یہ تمام معلومات مستند تاریخی حوالوں اور معتبر قلم کاروں کی رہین منت ہیں، ہمارا کام بحث وجستجو، تحقیق وتنقیح، جمع وترتیب اور استنتاج تک محدود ہے۔

بانیان مدرسہ:

دہلی میں آباد پنجابی برادری کے ایک نیک خصلت فرد حاجی کرم الٰہی ادھوڑی والے تھے، جو محنت مشقت سے زندگی بسر کرتے تھے، حاجی صاحب نیک انسان تھے اور نیک لوگوں سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے، سید نذیر حسین محدث دہلوی سے آپ کو خاص عقیدت تھی، ایک مرتبہ حاجی صاحب نے دہلی میں ایک چھوٹا سا گھر خریدنے کا پروگرام بنایا، گھر پسند کرکے حضرت میاں صاحب سے مشورہ کیا، میاں صاحب نے دو دفعہ منع کیا اور کہا کہ ابھی مت لو اور انتظار کرو، تیسری دفعہ ایک مکان

پسند کر کے مشورہ کیا تو میاں صاحب نے فرمایا کہ یہ مکان خرید لو، تمہارے لئے باعث خیر و برکت ہوگا، چنانچہ انہوں نے وہ مکان خرید لیا، اس کے بعد سے حاجی کرم الٰہی صاحب کا عروج شروع ہوا اور ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے۔

حاجی کرم الٰہی کے دو بیٹے تھے شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ عطاء الرحمٰن، ان دونوں بھائیوں کی تجارت ایک ہی تھی، ہول سیل (تھوک) کا یہ کام کرتے تھے، صدر بازار دہلی میں ایک بڑا سا ہال تھا، دروازے پر قد آدم سے بھی بڑے بڑے آئینوں کے دو پٹ تھے، اندر داخل ہونے پر دائیں طرف مالک دوکان کی سیٹیں تھیں، دوسری طرف دیواروں سے لگی ہوئی کرسیاں اور ٹیبل کلرکوں کے لئے لگی ہوئی تھیں، ہر وقت ٹائپ رائٹر کی کھٹا کھٹ اور ٹیلی فون کی ٹن ٹن گونجتی رہتی۔(۱)

یہ دونوں بھائی معروف ومشہور تاجر ہونے کے ساتھ دین پسند، علم دوست اور علماء نواز بھی تھے، تحریک جہاد کی مالی مدد میں یہ سرفہرست رہتے تھے، مولانا محمد اسلم سیف فیروز پوری لکھتے ہیں:

''حاجی عبدالرحمٰن مرحوم بھی جماعت مجاہدین کے ایک عظیم اور نہایت مخلص معاون تھے، تمام رؤسائے دہلی سے حاجی عبدالرحمٰن کا مالی تعاون جماعت مجاہدین کے ساتھ سب سے زیادہ ہوتا تھا۔''(۲)

مولانا غلام رسول مہر اپنی مشہور کتاب ''سرگذشت مجاہدین'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو شیخ عطاء الرحمٰن کے یہاں پھاٹک حبش خاں میں قیام فرماتے، جمعہ پڑھاتے تو خطبے میں سورہ قٓ اول سے آخر تک پڑھتے اور مختصر سی تقریر فرماتے، پھر وہ اور حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری اور دوسرے علماء ورؤساء اوکھلا میں جمع ہوتے، وہاں بنوٹ کے کرتب دکھائے جاتے جنہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے .....''۔(۳)

آگے ایک جگہ مہر صاحب نے جماعت مجاہدین کی اعانت کرنے والے خاص خاص ۲۳/لوگوں کے نام ذکر کیا ہے جن میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، حافظ عبداللہ غازی پوری اور شیخ عطاء الرحمٰن مہتمم مدرسہ رحمانیہ دہلی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔(۴)

ان حضرات کے اہل علم کی قدردانی اور ان پر اعتماد کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''ایک مرتبہ شیخ عطاء الرحمٰن جو عمر میں شیخ عبدالرحمٰن سے چھوٹے تھے ان کو شوق پیدا ہوا کہ زمین داری حاصل کی جائے اور زمین دارانہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی بسر کی جائے، جب انہوں نے بڑے بھائی شیخ عبدالرحمٰن کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا تو وہ اس کے لئے تیار نہ

(۱) پندرہ روزہ مجلّہ اہل حدیث، ہریانہ، شمارہ ۲۱/مئی ۱۹۷۹ء۔
(۲) ہفت روزہ الاعتصام لاہور، شمارہ ۱۱/ستمبر ۱۹۸۷ء۔
(۳) سرگذشت مجاہدین، ص:۶۲۶۔
(۴) ملاحظہ ہو: ص:۶۳۶-۶۳۷۔

ہوئے، ان کا خیال تھا کہ ہم لوگ شہر کے باسی تجارت کے ماہر ہیں، زمین داری کا انتظام ہم لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن شیخ عطاء الرحمٰن مصر رہے کہ زمینداری خریدی جائے، آخر کار شیخ عبدالرحمٰن نے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی سے اس کا تذکرہ کیا، ان کا مقصد یہ تھا کہ مولانا برادر خورد یعنی شیخ عطاء الرحمٰن کو سمجھا دیں گے تو وہ اس خیال سے باز آجائیں گے، لیکن مولانا رحیم آبادی نے مشورہ دیا کہ جب وہ اس کے لئے بضد ہیں تو آپ ان کی یہ خواہش پوری کردیں، تجربہ خود ان کو راستہ متعین کرنے میں مددگار رہے گا، چنانچہ اس کے بعد شیخ عبدالرحمٰن نے اس مشورے پر یوں عمل کیا کہ نوے (۹۰) لاکھ میں ایک بڑی زمین خرید کر ان کے حوالہ کردیا، سال ڈیڑھ سال کے بعد ہی شیخ عطاء الرحمٰن کو جب اس پیشہ کے حالات سے سابقہ پڑا تو دل برداشتہ ہوگئے اور توبہ کرنے لگے، بالآخر یہ زمین لاکھوں روپئے خسارہ پر فروخت کرکے چھٹکارا حاصل کیا اور اپنے سابقہ کاروبار میں مشغول ہوگئے۔''(۱)

یہ دونوں بھائی مولانا رحیم آبادی کی جوتیاں سیدھی کرنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے اور اتنے بڑے صاحب ثروت ہونے کے باوجود آپ کی خدمت میں مشغول رہا کرتے تھے۔(۲)

یہ لوگ مولانا کے اتنے دلدادہ تھے کہ برابر دہلی سے رحیم آباد خدمت میں حاضر ہوتے رہتے اور تحفہ تحائف کا انبار اپنے ساتھ لاتے رہتے، ایسی عقیدت تھی کہ زمانۂ علالت میں تو گویا ڈاک بٹھا دی تھی کہ مولانا رحیم آبادی کے حالات ہر دم ملتے رہیں، اور مرض کے لحاظ سے یہ لوگ سامان وغیرہ بھیجتے رہیں۔(۳)

جب ان دونوں بھائیوں نے کہولت کی حدود سے نکل کر شیخوخت کے مرحلہ میں قدم رکھا تو آپس میں طے کیا کہ اب تک کی تجارت کا حساب کتاب دیکھیں اور اپنے حین حیات ہی وراثت کا فیصلہ کرلیں، ہمارے بعد ہمارے بچوں میں یہ اتفاق واتحاد جو ہم دونوں بھائیوں میں ہے، وہ رہے نہ رہے، چنانچہ ساری جانچ پڑتال پر یہ معلوم ہوا کہ نقد اور زر وجواہرات کے علاوہ صرف جائیداد ہی اتنی ہے کہ اس کا ماہانہ کرایہ تیس ہزار روپئے ہے۔(۴)

دونوں حضرات کی مشترکہ پونجی میں سے تقریباً ایک لاکھ روپئے کے صرفہ سے مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ تعمیر کرایا گیا، اور پھر ان کے ذاتی خرچ سے یہ مدرسہ تادم آخر چلتا رہا، مدرسہ میں تعلیم کا آغاز شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء ہوا، دونوں بھائی اس کے انتظام وانصرام پر بھرپور توجہ صرف کرتے تھے، پہلے تعلیمی سال کے تکمیل کے وقت حاجی عبدالرحمٰن صاحب انتقال فرما گئے، آپ کے اوپر فالج کا حملہ ہوا اور بتاریخ ۱۷ر شعبان ۱۳۴۰ھ مطابق ۸ر اپریل ۱۹۲۲ء اس عالم فانی کو خیرباد کہہ گئے، إنا

(۱) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی: حیات وخدمات، ص:۹۴۔ (۲) ایضاً، ص:۹۳۔
(۳) ایضاً، ص:۹۴۔ (۴) مجلّہ اہل حدیث، ہریانہ، ۲۱ر مئی ۱۹۷۹ء۔

لله وإنا إليه راجعون۔(۱)

حاجی (عبدالرحمٰن) صاحب مرحوم کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حاجی عبدالستار صاحب نے اپنی توجہ مدرسہ کی جانب مبذول کی اور اس کام میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا، لیکن افسوس کہ آپ بھی عالم شباب میں وفات پا گئے، آپ کی والدہ صاحبہ کو اپنے دور حیات میں مدرسہ سے خاص دلچسپی تھی، طلبہ کے آرام وآسائش کے لئے آپ ہی نے برقی روشنی اور بجلی کے پنکھوں کا انتظام کیا۔(۲)

شیخ عطاء الرحمٰن (۱۸۸۲-۱۹۳۸ء) اپنے بھائی وبھتیجے کے انتقال کے بعد اکیلے اس ادارہ کو پوری دلجمعی اور دلچسپی کے ساتھ چلاتے رہے، موصوف علم دوستی، علماء نوازی، اخلاق حسنہ اور زہد وتقوی میں کس بلند مقام پر فائز تھے اس کی جانکاری کے لئے ان کے ان معاصرین کی طرف رجوع کرتے ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ کام کیا یا آپ کو قریب سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا، اس سلسلے میں چند اکابرین کی تحریریں ملاحظہ ہوں:

معروف عالم دین، خطیب ومؤلف مولانا محمد صاحب جونا گڈھی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''فیاضی اور سخاوت، کسر نفسی اور مروت آپ کے ذاتی اوصاف تھے، آپ کی سخاوت وفیاضی کسی خاص جماعت یا گروہ تک محدود نہ تھی، بلکہ اس سے ہر دور ونزدیک والا فائدہ اٹھاتا تھا، پانچ سو ہزار لے لیے اور غرباء کے گھروں میں جا کر بانٹ آئے، جاڑوں میں سینکڑوں لحاف اور کمبل غربا کو دیئے جاتے تھے، عموما لمبی چوڑی مرغن دعوتیں ہوتی رہتی تھیں، ہر صبح ایک معقول رقم لے کر چلتے تھے اور ہر شام خالی ہاتھ گھر پہنچا کرتے تھے، صرف اہل دہلی ہی نہیں بلکہ بیرونجات کے اصحاب بھی اس فیض کی بارش سے محروم نہ تھے، ہر سال کئی ایک کو حج کے لئے بھیجتے تھے، بہت سی کتابیں للہ فی اللہ تقسیم کرائیں، چھپوائیں، کئی ایک تفسیر محمدی خرید خرید کر لوگوں کو پہنچائیں اور بھی میری تصنیف کردہ کئی ایک کتابیں خود چھپوائیں، بعض معقول تعداد میں خریدکیں، اور غربا میں مفت تبلیغ کی، قرآن شریف برابر فی سبیل اللہ بانٹتے رہتے تھے، کئی ایک غربا اور بیوہ اور مساکین کے مہینے مقرر کر رکھے تھے، سارے شہر میں عزت ووقار کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ہر طبقہ کے لوگ آپ سے خوش تھے، مروت ولحاظ آپ میں بہت تھا، حق وباطل کی پوری تمیز تھی، مذہبا سخت اہل حدیث تھے، تہجد کی نماز بھی عموما ناغہ نہ ہوتی تھی ..... باوجود کروڑ پتی ہونے کے انتہا درجے کے متواضع تھے، خدا کی ہر راہ میں زر لٹاتے رہتے تھے گویا آپ ابوالمساکین ابوالطلبہ تھے، رحمہ اللہ''۔(۳)

(۱) اہل حدیث مرتسر: ۲۳/شعبان ۱۳۴۰ھ=۱۴/اپریل ۱۹۲۲ء، ص:۱۳۔

(۲) ہفت روز الاعتصام، لاہور، ۱۲/اگست ۱۹۹۴ء، ص:۲۰۔

(۳) اخبار محمدی، دہلی، ۱۵/جون ۱۹۳۸ء، ص:۹۔

مولانا نذیر احمد رحمانی املوی جو دارالحدیث رحمانیہ کے فارغ التحصیل اور وہاں کے ہیڈ مدرس تھے، شیخ عطاء الرحمٰن کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''آپ آج کل کے مالداروں کی طرح عیش پرست اور آرام طلب نہ تھے، گو آپ کے پاس اللہ کی دی ہوئی بے حساب دولت اور سامان تعیش کی فراوانی تھی، لیکن باوجود اس کے آپ پر اللہ کا خوف اور اس کا تقوی غالب تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ رات کے اخیر حصے میں (تقریباً ڈھائی تین بجے) سردی ہو یا گرمی، برسات ہو یا جاڑا، آرام کی نیند چھوڑ کر بستر سے اٹھ کھڑے ہوتے اور اس خیال سے کہ کسی نوکر یا خادم کو اس وقت جگانے سے اس کو تکلیف ہوگی، خود ہی لوٹے میں پانی بھرتے اور اگر ضرورت ہوتی تو خود ہی آگ جلا کر اس کو گرم بھی کر لیتے اور وضو کے بعد گھر کے ایک گوشے میں مصلی پر کھڑے ہو کر اپنے رب سے راز و نیاز (نماز تہجد) شروع کر دیتے، دیر تک حلاوت ایمان کا یہی لطف حاصل کرتے رہتے، یہاں تک کہ جب صبح صادق قریب ہوتی تو نماز فجر مدرسہ کے علماء اور طلبہ کے ساتھ ادا کرنے کے لئے اکیلے گھر سے نکل پڑتے اور تقریبا ڈیڑھ میل پیدل چل کر مدرسہ پہنچتے، یہاں سب کو عموماً سوتا ہوا پاتے، سب کی چارپائیوں کے پاس جا کر نہایت شفقت ومروت سے ایک ایک کو جگاتے، گرمیوں میں بہت سے لڑکے مدرسہ کی بلند اور وسیع چھت پر سونے کے لئے اپنی چارپائیاں لے آتے اور رات کو دیر تک کتابوں کے مطالعہ اور اسباق کی تکرار میں جاگتے رہتے، اس لئے صبح کو اٹھنے میں ذرا کسل مندی ہو جاتی تو محترم مرحوم کو نیچے اوپر تین تین چکر لگانا پڑتا، بار بار کبھی اس کے پاس جاتے اور کبھی اس کے پاس، لیکن بلندی اخلاق کا یہ عالم تھا کہ اس زحمت کی وجہ سے کبھی طبیعت پر ملال اور تکدر نہیں پیدا ہوا، اس درمیان میں صبح صادق طلوع ہو چکی ہوتی، اس لئے ادھر سے فارغ ہو کر مسجد میں تشریف لے جاتے اور اذان [اور سنت] سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل کے مطابق داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے، جب اور مصلی بھی اپنی اپنی سنتیں پڑھ چکتے تو فرض کی اقامت ہوتی اور سنت کے مطابق لمبی لمبی قرأت کے ساتھ فرض کی ادائیگی میں شریک رہتے، نماز کے بعد تھوڑی دیر مدرسہ میں بیٹھتے، رات بھر کی خیریت معلوم کرتے اور پھر پیدل ہی گھر واپس تشریف لے جاتے، گیارہ بجے کے قریب پھر اپنی خاص موٹر سے مدرسہ آتے اور اب شام تک یہیں رہتے، ظہر اور عصر کی نماز بھی ہمیشہ جماعت سے مدرسہ ہی میں ادا کرتے۔

آپ کے اخلاق اتنے بلند اور وسیع تھے کہ دشمن بھی اس سے مسحور تھے، جس کسی نے ایک مرتبہ بھی آپ سے ملاقات کر لی وہ ہمیشہ کے لئے آپ کا گرویدہ ہو گیا، آپ کی اس بزرگانہ اخلاقی برتری کا نتیجہ تھا کہ آپ ۱۱/ بجے دن سے شام ۴/ بجے تک غریب مسکین طالب علموں میں رہتے، نہایت خوشی اور دلی مسرت کے ساتھ اپنے ایام گزارتے، ہر طالب علم کی خیریت معلوم کرتے رہتے، اگر خدانخواستہ کوئی بیمار ہو جاتا تو خود جا کر اس کی بیمار پرسی کرتے، ڈاکٹر وحکیم کو ہدایتیں کرتے، بسا اوقات اپنے ہاتھ سے دوا پکا کر اور مل چھان کر لڑکوں کو پلاتے۔

مدرسہ میں کھانا تیار ہوتا تھا، اس کی نگرانی رکھتے تھے، کبھی کبھی خود اچانک منگا کر کھالیا کرتے تاکہ یہ معلوم کرسکیں کہ کیسا پکتا ہے، کبھی کسی کے ساتھ تکبر اور غرور کی باتیں نہیں کیں، علماء اور طلبہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اپنی عزت سمجھتے، بارہا میں نے دیکھا کہ اگر کبھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوسکے بلکہ کھلانے ہی میں رہ گئے تو کھانے کے بعد روٹی کے ٹکڑوں اور جوٹھے سالن کے برتنوں کو اپنے آگے رکھ لیتے اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ کھانے لگتے، اللہ اللہ کون ہے جو کروڑ پتی ہونے کے باوجود ان اخلاق عالیہ سے مزین ہو''۔(۱)

مولانا عبدالغفار حسن رحمانی بیان کرتے ہیں:

''شیخ عبدالرحمٰن انتہائی سخی اور فیاض ہونے کے ساتھ ساتھ سخت طبیعت کے مالک بھی تھے، جب کوئی لڑکا ان کے سامنے غلط بیانی کرتا یا مدرسہ کے نظام کی خلاف ورزی کرتا تو بہت زیادہ ناراض ہوتے، شیخ عبدالرحمٰن مدرسہ کی بنیاد رکھنے کے بعد صرف ایک سال تک زندہ رہے پھر ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی شیخ عطاء الرحمٰن مدرسہ کے کفیل مقرر ہوئے، یہ بڑی عمر کے انتہائی دیندار اور متشرع انسان تھے، تمام لوگ ان کو بڑی عزت اور قدر واحترام کی نگاہ سے دیکھتے، حتی کہ ریڑھی اور مزدوری کرنے والے مزدوروں کی بھی کوشش ہوتی کہ ہر صبح شیخ عطاء الرحمٰن کی مزدوری سے اپنے کاروبار کا آغاز کریں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے ان پر خیر وبرکت کے دروازے کھل جاتے ہیں، پھر سارا دن خوب منافع ہوتا ہے۔

شیخ عطاء الرحمٰن اگرچہ بذات خود عالم دین نہ تھے مگر انہیں علم اور علماء سے گہرا قلبی تعلق تھا، عام طور پر روزانہ اپنے کاروبار کو بچوں کے سپرد کرکے خود مدرسہ رحمانیہ آجاتے اور ان کے ساتھ ایک صاحب شیخ محمد تینا وری بھی ہوتے، یہ مدرسہ کے قریب ہی ایک عالیشان عمارت میں رہائش پذیر تھے، فجر کے وقت جب شیخ عطاء الرحمٰن مدرسہ رحمانیہ آتے تو پچیس کے قریب کمروں میں رہائش پذیر تمام طلبہ کو خود ہر دروازے پر دستک دے کر نماز فجر کے لئے بیدار کرتے اور پھر خود ان کے ساتھ مل کر نماز باجماعت ادا کرتے اور پھر مدرسہ رحمانیہ کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ بیٹھتے، بڑے سخی، فیاض اور دریادل انسان تھے، دینی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے، اخلاق کے بھی بہت اچھے تھے، طلبہ کے ساتھ بہت زیادہ شفقت ومحبت اور الفت کا برتاؤ کرتے تھے، انہیں بھی جھوٹ سے سخت نفرت تھی، اگر کوئی طالب علم کسی موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا یا مدرسہ کے نظام کی خلاف ورزی کرتا تو فورا مدرسہ سے خارج کردیتے، بعض اوقات رحمانیہ کے طلبہ کو پکنک منانے کے لئے نہر کے کنارے لے جاتے اور بذات خود خاص اہتمام کے ساتھ اشیائے خورد ونوش اور پھل مٹھائی کے ذریعہ ان کی تواضع کرتے، طلبہ پکنک منانے میں مصروف ہوتے اور یہ انہیں دیکھ کر خوش ہورہے ہوتے''۔(۲)

(۱) رسالہ محدث، دہلی، نومبر ۱۹۳۸ء بحوالہ ماہنامہ السراج جھنڈانگر نیپال، مئی-اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص: ۴۳۱-۴۳۲، حاشیہ۔

(۲) ماہنامہ صراط مستقیم برمنگھم، نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء، ص: ۱۴۔

محترم فاروق اعظمی صاحب شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی اور رسالہ محدث دہلی کے حوالے سے شیخ عطاء الرحمٰن صاحب کے معمولات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شیخ عطاء الرحمٰن صاحب مہتمم ادارہ کا یہ روزمرہ کا معمول تھا کہ صبح فجر سے قبل روزانہ پھاٹک حبش خاں سے مدرسہ رحمانیہ تک پیدل چل کر آتے اور ہاتھ میں ڈھیر سی ریزگاری لیتے آتے جسے فٹ پاتھ کے غریب غربا اور حاجت مندوں کو رات کے اندھیرے میں تقسیم کردیتے، بارہا ایسا بھی ہوتا کہ گلی کوچے کے بدنام، اچکے اور جرائم پیشہ (جو رات کی تاریکی میں راہگیروں کو اپنا شکار خاص سمجھ کر اچک لیا کرتے تھے) سے بھی آمنا سامنا ہوجاتا مگر کبھی بھی وہ ان سے تعرض نہ کرتے تھے، بس اتنا کہتے: ''اچھا میاں جی ہیں کیا؟'' اور پھر سر جھکائے ندامت اور شرمندگی سے دوسری طرف نکل جاتے......صبح آٹھ بجے سے شام ۴؍بجے تک مدرسہ کے پھاٹک کے پاس چارپائی ڈال کر پڑے رہتے اور ہر طرح کے نظم ونسق اور درس وتدریس کی نگرانی کیا کرتے، کیا مجال تھی کہ کوئی لیٹ آتا یا اساتذہ گھنٹی کے ساتھ اپنے درس میں مشغول نہ ہوتے، یا کوئی لڑکا بلاوجہ ادھر ادھر گھومتا نظر آتا، نگرانی کسی ڈکٹیٹر یا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی نگرانی نہ تھی بلکہ ایسے دل دردمند کا کرشمہ تھا جس کے چشم وابرو کے اشارے پر مدرسہ کا ذرہ ذرہ حرکت میں آجاتا تھا، یہ موصوف کے اخلاص وایثار اور للّٰہیت کا ثمرہ تھا کہ ہر شخص سراپا علم وعمل بنا ہوا تھا۔

ادارہ میں طلبہ ملک کے گوشے گوشے سے آتے تھے، ان میں کم سن بھی ہوتے تھے اور باشعور بھی، لیکن وہ یہاں آکر اپنے ماں باپ، بھائی بہن، دوست احباب اور وطن عزیز کی محبت رکھتے تھے اور خود مہتمم صاحب ان سے اس طرح خوش دلی اور نرمی سے پیش آتے تھے کہ لڑکوں کو ان سے ایک باپ کی شفقت، جاں نثار بھائی کی محبت، اور عزیز دوست کی رفاقت کا احساس بیک وقت محسوس ہوتا تھا، طلبہ واساتذہ کے خورد ونوش اور رہائش کا بہترین انتظام فرماتے تھے، غریب ویتیم اور مسکین طلبہ کے ساتھ خصوصی محبت سے پیش آتے تھے اور ان کو مختلف مراعات بہم پہنچاتے تھے......''۔(۱)

علم وعلماء کا یہ خادم، کتاب وسنت کا شیدائی، حاتم وقت ۳۰؍ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ۳۱؍مئی ۱۹۳۸ء و یکم ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ مطابق یکم جون ۱۹۳۸ء کی درمیانی شب ساڑھے گیارہ بجے اس دار فانی کو خیر باد کہہ گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ کی نماز مولانا محمد صاحب جوناگڈھی نے پڑھائی۔ پسماندگان میں تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں چھوڑیں، آپ پردادا ہوچکے تھے۔(۲) (جاری)

☆☆☆

(۱) ماہنامہ محدث بنارس، اکتوبر ۱۹۸۴ء، ص:۲۲۔

(۲) شیخ عطاء الرحمٰن کی بیماری، وفات اور جنازہ وغیرہ سے متعلق تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اخبار محمدی، دہلی، ۱۵؍جون ۱۹۳۸ء و یکم جولائی ۱۹۳۸ء۔

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ اور خدمت خلق

مامون مظہر/متعلم جامعہ سلفیہ

اسلام انسانی زندگی کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس نے ہر شعبۂ حیات میں اس قدر گہرائی و گیرائی کے ساتھ رہنمائی کی ہے کہ کسی بھی زاویہ سے کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا، معاشرے میں لوگوں کے ساتھ کس طرح اخلاق و کردار کا مظاہرہ ہونا چاہئے اور کیسے پیش آنا چاہئے یہاں تک کہ پیشاب اور پاخانہ کے بھی اصول بتائے ہیں تا کہ ایک انسان اسے عملی جامہ پہنا کر اپنی انمول صحت اور گراں قدر زندگی کو محفوظ رکھ سکے۔

اسلام نے جن معاشرتی اخلاق و کردار کے مظاہرے کا حکم دیا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد دوسرے کی حتی المقدور مدد کرے جسے اصطلاح میں خدمت خلق سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں جو غریب اور نادار لوگ ہیں وہ چین وسکون کی زندگی گزاریں اور معاشرہ ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ رہے کیونکہ آدمی پیٹ ہی کے لئے چوری اور اس طرح کے دوسرے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ اب مسلم معاشرے میں یہ ساری چیزیں عنقا ہوتی چلی جارہی ہیں پھر بھی اللہ جل شانہ کبھی کبھی ایسے افراد پیدا کرتا ہے جو خدمت کے جذبے سے لبریز ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ، ان کی مصیبت کو اپنی مصیبت اور ان کی بیماری کو اپنی بیماری سمجھتے ہیں اور قوم کے لئے ایک ایسی آنکھ کے مانند ہوتے ہیں جو جسم کے کسی بھی حصہ میں درد سے بے قرار ہو کر آنسو بہا دیتی ہے، انہیں میں سے شیخ ابن باز رحمہ اللہ بھی تھے جن کی زندگی کا مطالعہ کرنے اور حالات زندگی پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے ان کو دوسروں کی خدمت ہی کے لئے پیدا کیا تھا، آپ کے اندر خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، دوسروں کی مدد کے لئے ہمیشہ بیتاب رہا کرتے تھے، آنکھ کی روشنی جیسی عظیم نعمت سے محروم ہونے کے باوجود دنیا کو روشن کر دینے کا جذبہ رکھتے تھے۔

نام ونسب اور پیدائش

عبدالعزیز بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ آل باز، آپ ریاض شہر کے اندر ۱۲ر ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے اور یہیں پر آپ کا بچپن گزرا۔

آنکھ کا مرض

۱۳۴۶ھ میں آپ کی آنکھ بیماری سے متاثر ہوگئی جس کی وجہ سے محرم ۱۳۵۰ھ میں آپ بینائی سے محروم ہوگئے۔

تعلیم

سن بلوغت کو پہنچنے سے پہلے ہی آپ نے تکمیل حفظ قرآن کریم کرلیا پھر علوم شرعیہ اور علم لغت میں مہارت حاصل کی، طلب علم کا یہ سلسلہ زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، مختلف عہدے اور مناصب کے باوجود آپ اس سے غافل نہیں ہوئے بلکہ دن ورات حصول علم میں لگے رہے، یہی وجہ ہے کہ آپ علم کے ایسے مقام پر فائز ہوئے جہاں کم ہی لوگوں کی رسائی ہوتی ہے، خصوصا علم حدیث میں آپ کو اس قدر ید طولی حاصل تھا کہ حدیث کے صحت وسقم کے بارے میں آپ کا فیصلہ کافی معتبر سمجھا جاتا ہے۔

اساتذہ

آپ کے مشہور اساتذہ یہ ہیں: (۱) الشیخ محمد بن عبداللطیف بن عبدالرحمٰن بن حسن الشیخ محمد بن عبدالوہاب (قاضی ریاض) (۲) الشیخ صالح بن عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن حسن بن الشیخ محمد بن عبدالوہاب (۳) الشیخ سعد بن حمد عتیق (قاضی ریاض) (۴) الشیخ احمد بن فارس (۵) سماحۃ الشیخ محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف آل الشیخ جو مملکت سعودی عرب کے مفتی رہے ہیں۔

تصنیفات

حالات وظروف کے مطابق شیخ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، ان سب کے ذکر کا یہاں موقع نہیں، اس لئے صرف چند کتابوں کا تذکرہ کررہا ہوں: (۱) الدعوة الى الله وأخلاق الدعاة (۲) التحذير من البدع (۳) حكم الإسلام في من طعن في القرآن أو في رسول الله (ﷺ) (٤) العقيدة الموجزة وما يضادها (٥) فتح الباری پر کتاب الحج تک مفید حاشیہ۔ اس کے علاوہ آپ کی بہت ساری تصنیفات، فتاوے اور رسائل ہیں۔

عہدے اور مناصب

بوقت انتقال درج ذیل اہم عہدوں اور مناصب پر فائز تھے۔

(۱) مفتی عام سعودی عرب (۲) چیئر آف سینئر علماء کمیٹی (۳) صدر ادارۃ البحوث العلمیۃ والافتاء (۴) صدر تاسیسی

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ ودیگر متعدد اسلامی تنظیموں کی بھی سرپرستی فرمارہے تھے۔(۵) صدر عالمی مساجد کمیٹی (۶) ممبر آف مدینہ یونیورسٹی (۷) ممبر اسلامک دعوۃ کمیشن سعودی عرب (۸) ممبر مشاورتی بورڈ وامی (۹) ممبر برائے اسلامک فنڈ برائے یوتھ ڈیولپمنٹ (۱۰) صدر فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ۔

قوت حافظہ اور استحضار

قوت حافظہ حد درجہ پختہ اور مضبوط، استحضار کی قوت، مسائل کے افہام وتفہیم میں برق رفتار سرعت، علمی استدلال کا ملکہ، تمیز احادیث پر کامل عبور، ان تمام اوصاف سے آپ پوری طرح متصف تھے، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی آپ سے کتب ستہ کی احادیث منتقدہ کے متعلق سوال کیا جاتا تو آپ اس کی سند، اس کے رجال، رجال کے حالات اور اس پر علماء کی رائے اس تفصیل سے بیان فرماتے کہ سامع عش عش کر اٹھتا، مگر یہ اوصاف انہیں کے حصہ میں آتے ہیں جن کو اللہ تعالی اپنی خاص نوازش سے نواز دے، اللہ تعالی کی آپ پر خاص نوازش بھی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے قرآن حفظ کرنے کے بعد صحیحین کو بھی حفظ کرلیا، ایک مرتبہ دسترخوان پر آپ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے صحیحین حفظ کرلی ہے تو آپ نے فرمایا: ہاں، وللہ الحمد والمنۃ، مگر صحیح مسلم نظر وتربیط کی محتاج ہے۔(۱)

وفات

علم وعمل کا یہ تناور درخت ۲۷ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳/۵/۱۹۹۹ء کو ہمیشہ ہمیش کے لئے اس دار فانی کو الوداع کہہ گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شیخ ابن باز اور فقراء

شیخ ابن باز علیہ الرحمۃ فقراء ومساکین، غربا وضرورت مندوں کا ماوی وملجا تھے، ہر قسم کے ضرورت مند ہر وقت آپ کے پاس آتے رہتے اور آپ ان کی ضروریات کو پوری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ فرماتے، ان کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری حفظہ اللہ لکھتے ہیں: ''ضرورت مندوں کی آمد کا کوئی وقت متعین نہیں تھا، گھر، آفس، جامعہ یا مسجد جہاں بھی شیخ موجود ہوتے یہ حضرات وہاں پہنچتے اور ضرورت پیش کرتے، بہت کم ایسا ہوتا کہ شیخ ان سے معذرت کرتے، اس طرح کے ضرورت مندوں کی آمد کبھی کبھی دوسرے حاضرین پر شاق گزرتی لیکن شیخ کا دل سب کے لئے کشادہ رہتا، وہ سب کی سنتے اور جو کچھ میسر ہوتا اسے پیش فرماتے، ضرورت مندوں میں زیادہ تر تعداد طلبہ اور نوجوانوں کی ہوتی جو شیخ کی مجلس میں پہنچ کر اپنی مشکلات کا مداوا چاہتے، ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے جو دست طلب دراز کرنے کے عادی تھے، ان کو بھی شیخ

(۱) الانجاز فی ترجمۃ الامام عبدالعزیز بن باز ص ۴۲۔

مایوس نہ فرماتے۔(۱)

فقراء ومساکین کی اہانت کو آپ کبھی پسند نہیں فرماتے، ادنی واعلی ہر قسم کے لوگ آپ سے مستفیض ہوا کرتے تھے، آپ کا دسترخوان فقراء ومساکین سے کبھی خالی نہیں رہتا، یہ لوگ کھانے کے لئے آپ کے دسترخوان پر ایک بھیڑ کی صورت میں ٹوٹ پڑتے تھے، پھر بھی آپ فرماتے: انہیں واپس نہ کرو اور نہ کبھی بلا وجہ کسی سائل کو مایوس کیا، شیخ کے اندر خدمت خلق خصوصا ناداروں اور مسکینوں کی مدد کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، دوسروں کا تعاون اور مدد کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، اسی لئے آپ کو غرباء ومساکین کے حق میں شفیق باپ کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ کئے دیتا ہوں۔

ایک نادر واقعہ

شیخ علیہ الرحمۃ ۱۳۸۹ھ میں رابطہ عالم اسلامی کے دفتر میں تھے، کشادہ دلی اور حسن اخلاق سے لوگوں سے بات کر رہے تھے، اتنے میں ظہر کا وقت ہو گیا، لوگ رابطہ سے متصل ایک مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے جب نماز سے فارغ ہوئے تو کچھ سعودی حضرات کی جماعت آئی اور انہوں نے اپنی زکوۃ کی رقم شیخ کے حوالے کر دی، شیخ تھوڑی دیر اطمینان سے مسجد میں بیٹھے رہے، نماز کے بعد اصحاب حاجات، فقراء ومساکین پہنچ گئے تو جو بھی ان کے ساتھ میں مال تھا ہر ایک کے حالات وحاجات کو سن کر حسب ضرورت نقد تقسیم کر دیا اور ہر ایک کے ساتھ غمخواری کی یہاں تک کہ ان کے پاس جو مال تھا فقراء میں تقسیم ہو گیا، بسا اوقات فقراء ومساکین کی حاجت میں اپنے مال کو بھی تقسیم کر دیا کرتے تھے۔(۲)

ایسے ہی ایک بار ایک حاجت مند جامع مسجد ترکی بن عبداللہ ریاض کے جنوبی دروازے سے شیخ کے ساتھ باہر آیا، شیخ اپنی گاڑی تک پہنچ گئے مگر اس شخص کی بات پوری نہ ہو سکی، شیخ نے فرمایا گاڑی میں بیٹھ جاؤ راستے میں بات کریں گے وہ شخص کچھ جھجھکا اور کہنے لگا جناب میں مسجد کے شمالی دروازے سے داخل ہوا تھا، میرا جوتا وہیں ہے، شیخ نے فرمایا: تم اپنے جوتے لے آؤ میں تمہارا انتظار کروں گا، شیخ اس کی واپسی تک ٹھہرے رہے، گاڑی اس وقت حرکت میں آئی جب شیخ گاڑی میں پہنچ گئے۔(۳)

آپ کسی پریشان حال مسلمان کو دیکھ کر بے تاب ہو جایا کرتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا اس کے غم میں شریک ہوتے اور اس کی پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کرتے، چنانچہ ۱۳۶۰ھ میں جب ''دلم'' شہر سخت ترین سیلاب کی زد میں آ گیا تو شیخ نے

(۱) ماہنامہ محدث، جولائی، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۸۵، ۸۶۔
(۲) اخبار عالم اسلامی، ۱۲ر جون ۱۹۹۹ء۔
(۳) نور توحید جون تا اگست ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۔

اپنے گھر سے کھجور اور قہوہ لوگوں کے لئے بھیجا۔

آپ غریبوں کا کس قدر خیال رکھتے اور ان پر کس قدر خرچ کیا کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے شاگرد رشید عبداللہ بن منیع کی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے، کہتے ہیں کہ ''شیخ ڈھائی ہزار ریال سے زیادہ یومیہ خرچ کرتے تھے اور مہینہ ختم ہونے سے پہلے مقروض ہوجایا کرتے تھے، کبھی کسی سائل کو واپس نہیں کرتے تھے۔(۱)

فقراء کے لئے قرض اور اس کی ادائیگی

جس طرح شیخ لوگوں کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور زندگی کے دوسرے لوازمات کا لحاظ رکھتے تھے ایسے ہی اگر کوئی شخص مقروض ہوتا تو اپنے پاس سے اس کے قرض کی ادائیگی بھی کردیتے نیز دوسروں کی حاجات کے لئے اگر قرض بھی لینا پڑتا تو اس سے بھی نہ چوکتے جس کی بہترین مثال درج ذیل واقعات ہیں:

ایک شخص کا بیان ہے کہ ہمارے دوستوں میں سے ایک شخص چار لاکھ ستر ہزار مقروض تھا، قرض کی ادائیگی کے لئے شیخ سے ملا، اس کے بیان کی سچائی کا جب شیخ کو یقین ہوگیا تو سماحۃ الشیخ نے صاحب السمو الملکی امیر عبدالعزیز بن فہد کو خط لکھا کہ اس مقروض کی رقم ادا کردیں اور اگر آپ اس کے ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں تو معاملہ خادم الحرمین الشریفین تک پہنچا دیں، چند یوم گزرنے کے بعد شیخ عمر فلاتہ نے رقم ادا کردی۔(۲)

سعودی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوچکی ہے کہ آپ نے عطیہ سالم سے ۲۰۰ ریال قرض طلب کیا تو انہوں نے متعجب ہوکر عرض کیا کہ آپ دوسو ریال خزانہ سے وظیفہ کی رقم سے پیشگی کیوں نہیں طلب کرلیتے؟ تو شیخ نے جواب دیا کہ چار سو ریال سے زائد اپنے وظیفہ سے بطور پیشگی لے چکا ہوں، اب مزید نہیں لینا چاہتا، شیخ ہمیشہ اسی طرح لوگوں کی مدد کرتے تھے جو مختلف ملکوں سے اس مقصد کے لئے آتے تھے۔(۳)

یقیناً شیخ اس قسم کا قرض دوسروں کی امداد کے لئے لیا کرتے تھے، کیونکہ آپ کا اپنا ذاتی خرچ بہت کم تھا، چنانچہ رانا شفیق پسروری لکھتے ہیں: ''شاہ فیصل مرحوم اپنی دینی رہنمائی کے لئے ان سے رجوع کرتے تھے، اس عظیم رتبے کے باوجود شیخ ابن باز تواضع وانکساری کا مجسمہ تھے، ان کے شاگرد بتاتے ہیں کہ پوری یونیورسٹی میں سب سے زیادہ تنخواہ لینے کے باوجود سب سے سستا لباس ان کا ہوتا تھا، اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتے تھے اور آمدنی کا بیشتر حصہ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے

(۱) ماہنامہ السراج جون، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ۸۲، ۸۱۔
(۲) ماہنامہ السراج جون، جولائی ۱۹۹۹ء ص ۳۸۔
(۳) رابطہ عالم اسلامی ۲۱ رجون ۱۹۹۹ء۔

طلبہ کی ذاتی ضرورتوں پر خرچ کرتے تھے۔(۱)

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک

شیخ علیہ الرحمۃ پڑوسیوں کا لحاظ رکھتے اور حدیث رسول "ما زال جبريل يوصيني بالجار حتى ظننت انه سيورثه" (۲) کے پیش نظر ان کی امداد بھی کیا کرتے تھے، جس کی زندہ مثال آنے والا واقعہ ہے۔

آپ کے پڑوس میں ایک شخص مدت سے آباد تھا، ایک مرتبہ اس کے مکان میں آگ لگنے کا حادثہ پیش آ گیا، مکان مع ساز وسامان جل گیا، شیخ کے پاس وہ لوگ روتے ہوئے آئے، شیخ نے موقع پر جا کر حالات کا جائزہ لیا اور غمزدہ لوگوں کو تسلی دی اور ان کو نیا تعمیر شدہ مکان رہائش کے لئے عنایت فرمایا، آپ کے وہ پڑوسی آپ کا ذکر خیر کر کے اور آپ کے محاسن یاد کر کے رویا کرتے تھے۔(۳)

شادی کے خواہش مندوں کا تعاون

ابن باز علیہ الرحمۃ کی توجہ اس بات پر زیادہ ہوا کرتی تھی کہ مسلمان مرد اور عورتیں اپنی زندگی عفت و پاکدامنی کے ساتھ گزاریں، اس مقصد کے حصول کے لئے وہ غیر شادی شدہ مرد وعورت کی شادی کی بھرپور کوشش کرتے نیز شادی اور اس سے متعلق امور کو آسان کرنے کی سعی کرتے تاکہ غریبوں کو بھی شادی میں کوئی دشواری نہ ہو، اس لئے مہر وغیرہ کو بہت زیادہ رکھنے سے منع فرماتے۔

آپ نے شادی کے خواہش مند مگر وسعت نہ رکھنے والوں کے لئے ۱۴۰۰ھ میں ایک مشروع کا آغاز کیا، جو آپ کی زیر سرپرستی چلتا رہا، اس مشروع کے تحت اگر کوئی خواہش مند شرائط پوری کرتا تو آپ کی جانب سے ۲۵/ ہزار ریال دیا جاتا تاکہ وہ بھی شادی کر کے سکون کی زندگی گزار سکے۔(۴)

ایک بار ایک شخص نے عشاء کے بعد شیخ کے گھر میں امریکہ سے فون کیا، گفتگو کے دوران شیخ کو اندازہ ہوا کہ یہ شخص عرب نژاد ہے، اس نے فتوی پوچھا اپنی شادی سے متعلق امداد کا طالب ہوا، شیخ نے مومنانہ فراست سے اس کی محتاجی کا اندازہ لگایا اور فوراً ہی فرمایا کہ اپنا نمبر دے دو، ہم ابھی تم سے گفتگو کریں گے تاکہ تم زیر بار نہ ہو، تھوڑی دیر بعد شیخ نے اس شخص سے گفتگو کی اور بات مکمل فرمائی۔(۵)

---

(۱) ماہنامہ محدث جولائی، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۶۵۔
(۲) متفق علیہ، صحیح بخاری کتاب الادب، باب الوصاۃ بالجار: ۶۰۱۵۔
(۳) ماہنامہ السراج جون، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ۳۸۔
(۴) جوانب من سیرۃ الامام عبدالعزیز بن باز ص ۳۶۴۔
(۵) نور توحید جون تا اگست ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۔

شیخ جہاں نوجوانوں کی شادی پر توجہ دیتے تھے وہیں بیوہ اور دوسری ضرورت مند عورتوں کو بھی کسی قسم کی تکلیف پہنچنا پسند نہیں کرتے اور ان کی مدد کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک فلپائن کی خاتون کا خط آیا تھا کہ میرے شوہر کو عیسائیوں نے ایک کنویں میں ڈال کر ہلاک کر دیا، میں بیوہ ہوگئی، میرے بچے یتیم ہوگئے، اب اللہ کے بعد میرا اس دنیا میں کوئی سہارا نہ رہا، میں نے لوگوں سے پوچھا اب ہمارا بار کون اٹھا سکتا ہے تو لوگوں نے آپ سے فریاد کا مشورہ دیا، اس کی فریاد سن کر شیخ بہت متاثر ہوئے، تعاون کے متعلق ادارے کو لکھا، ادارے نے معذرت کر دی کہ بجٹ نہیں ہے، آپ نے ادارے کو دوبارہ لکھا کہ اس عورت اور بچوں کا خرچ میری تنخواہ سے وضع کر کے فوراً بھیج دیجئے۔

علماء، دعاۃ اور طلبہ کی کفالت

سماحۃ الشیخ جس طرح دعوت وتبلیغ کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے، اسی طرح انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ معاشرے کی اصلاح دین کے صحیح عقائد کی نشر واشاعت اور دعوت وتبلیغ سے ممکن ہے، اسی لئے شیخ نے اس کام کو مختلف انداز سے بنفسہ انجام دیا اور جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال دعوت وتبلیغ اور اسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت کے لئے جائز قرار دیا جسے آج بھی کچھ لوگ ناجائز کہتے ہیں، نیز آپ نے دنیا بھر میں علماء ودعاۃ کی ایک ٹیم بھیجی اور ان کی کفالت کی حتی الامکان کوشش کرتے تھے، آپ نے دنیا کے مختلف علاقوں میں قرآن کے معلم بھیجوائے بڑے بڑے تجار خود حاضر ہو کر دعوت وتبلیغ کی اس مہم میں شیخ کا ہر طرح تعاون فرماتے۔

شیخ کی مدارس کو امداد

شیخ نے جہاں فرداً فرداً فقراء ومساکین کی مدد کی، حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کیں، نوجوانوں کی شادیاں کرائیں، طلبہ ودعاۃ کی کفالت کی، وہیں اجتماعی طور پر بھی آپ نے امداد کی اور مدارس وغیرہ کا خوب خوب تعاون کیا تاکہ قوم کے غریب ونادار بچے جو والدین کی نعمت سے محروم ہیں یا والدین تو ہیں مگر اپنے بچوں کی تعلیم دینے کی استطاعت نہیں رکھتے، ایسے بچوں کو بھی بآسانی تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل سکے اور اپنے دین ودنیا دونوں کو سنوار سکیں۔

سماحۃ الشیخ اور دار الحدیث الخیریۃ

مدارس وجامعات کے فضلاء ہی عموماً دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہیں اور شیخ کی دعوت کی طرف کافی توجہ ہوتی تھی، اس لئے مدارس وجامعات کو اسی پس منظر میں دیکھتے اور اس کا تعاون کرتے، مگر دار الحدیث الخیریۃ مکۃ المکرّمۃ کی طرف آپ کی توجہ زیادہ تھی کیونکہ آپ کو اس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، اس لئے آپ نے ۱۳۸۱/۵/۷ھ کو ایک خط دار الحدیث کے مدیر شیخ محمد عمر عبدالہادی کو لکھا جس وقت آپ نائب رئیس الجامعۃ الاسلامیۃ تھے کہ آپ کے طلاب ہمارے جامعہ میں بغیر داخلہ

امتحان کے قبول کئے جائیں گے۔(۱)

چونکہ شیخ کی خاص توجہ تھی دارالحدیث الخیریہ، اس کی تعمیر وترقی ودیگر اہم امور کی طرف، اس لئے ۱۳۸۶ھ میں شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ کی صدارت میں سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز کو عضو خاص بنایا گیا اور آپ کی تعظیم وتوقیر کی گئی۔(۲)

مائدۃ الشیخ

شیخ ابن باز انتہائی سخی اور فیاض انسان تھے، ان کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگ ان کو عصر حاضر کا حاتم طائی کہتے ہیں، آپ کی اس سخاوت میں یقیناً خدمت خلق کا جذبہ مضمر رہتا تھا اور آپ کے ذہن میں اللہ کے نبی ﷺ کی وہ حدیث ہمیشہ موجود رہا کرتی تھی جس میں آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالی کہے گا: "یا ابن آدم استطعمتك فلم تطعمني قال یا رب وكيف أطعمك؟ وأنت رب العالمين، قال أما علمت انه استطعمك عبدي فلان فلم تطعمه" (۳) اسی لئے آپ کے گھر بڑے بڑے دسترخوان لگا کرتے تھے، جب آپ دوپہر دو بجے دفتر سے لوٹتے تو گھر پر آئے ہوئے مہمانوں پر جوش استقبال کرتے اور انہیں ساتھ میں کھانا کھلاتے اور یہی سلسلہ ہمیشہ چلا کرتا تھا، اگرچہ مہمانوں کی تعداد معتد بہ ہوا کرتی تھی، آئے ہوئے یہ مہمان رات کو بھی آپ ہی کے دسترخوان پر تناول فرماتے اور آپ کی مہمانی میں رات بسر کرتے، شیخ کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا تھا اور جب تک ایک جم غفیر آپ کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوتا خود کھانا نہ کھاتے تھے، شیخ کے گھر میں ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا، جس میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چاول خالص عربی انداز میں دسترخوان پر لگا دیئے جاتے تھے اور دسترخوان پر امیر غریب، علماء، طلبہ، مفکرین، ادباء اور مسافر ہر قسم کے لوگ موجود ہوا کرتے تھے۔

شیخ علیہ الرحمۃ کے سکریٹری ڈاکٹر محمد لقمان سلفی لکھتے ہیں: ''مشہور دیوبندی عالم مولانا فضل اللہ جیلانی (الادب المفرد للبخاری کے شارح) حضرت الشیخ سے ملنے کے لئے آئے، شیخ نے انہیں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی، جب شیخ اور تمام مہمان دسترخوان پر بیٹھ گئے تو انہوں نے ایک یمنی خادم کے بارے میں پوچھا جو ان کے گھر میں برتن دھویا کرتا تھا کہ وہ دسترخوان پر موجود ہے؟ جب انہیں بتایا گیا کہ وہ ابھی نہیں آیا ہے تو اسے پکارنا شروع کیا اور اس وقت تک کھانا شروع نہیں کیا جب تک وہ خادم دسترخوان پر بیٹھ نہیں گیا، مولانا جیلانی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ شیخ کا لڑکا ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ ایک خادم ہے جو باورچی خانے میں کام کرتا ہے تو حیرت واستعجاب سے شیخ کی طرف دیکھنے لگے اور کھانا کھانے کے بجائے رونے لگے اور کہنے لگے کہ اس عظیم تواضع اور کمزوروں کے ساتھ ایسی شفقت ومہربانی کی مثال میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی اور نہ تاریخ کے صفحات ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں۔(۴)

☆☆☆

(۱) جوانب من سیرۃ الامام عبدالعزیز بن باز، ص ۳۷۳۔
(۲) جوانب من سیرۃ الامام عبدالعزیز بن باز، ص ۳۷۳۔
(۳) رواہ مسلم فی صحیحہ: ۲۵۶۹۔
(۴) البلاغ ممبئی ص ۲۲۔

۱۸۵۷ء کی دِلّی
غالب کے مکاتیب میں

ڈاکٹر رشیدہ خاتون
ریڈر، ویمنس کالج، بنارس ہندو یونیورسٹی

اورنگ زیب کی موت (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت کی شان وشوکت اور صولت ودولت روز افزوں زوال پذیر تھی، ملک میں ہر طرف انارکی اور طوائف الملوکی چھائی ہوئی تھی، جس کو جہاں موقع ملتا وہاں کا بادشاہ بن جاتا، رفتہ رفتہ سکھوں، جاٹوں اور روہیلوں کی تحریکوں نے زور پکڑا اور مغلوں کے زوال میں ان تحریکوں کا بڑا ہاتھ تھا، ۱۷۳۹ء میں نادرشاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔(۱) نادرشاہ کے قتل عام اور لوٹ مار نے سلطنت کی زندگی پر کاری ضرب لگائی، نادرشاہ کے بعد اس کے افغان جانشین احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا آغاز ہوا، ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۱ء تک کے درمیان احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر متعدد حملے کئے، لیکن ابدالی ہندوستان میں اپنے اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط نہ کرسکا، افغانستان کے داخلی مسائل، فوجیوں کی سرکشی اور سکھوں کی فوجی طاقت نے ابدالی کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

انگریز ابتدا میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے، لیکن بعد میں انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے قدم دھیرے دھیرے جمانے شروع کردیے تھے۔ ''۱۷۸۵ء تک کمپنی کو ملک فتح کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی''(۲) کمپنی کے ڈائرکٹری، گورنر جنرلوں کو بار بار تاکید کی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں، لیکن ملک کے بگڑے ہوئے حالات اور ان کی فطرت، دخل اندازی کے لئے انہیں مجبور کرتی تھیں، آخر کار ۱۷۸۶ء میں ایک قانون پاس ہوا جس میں گورنر جنرل کو سپہ سالار اعظم تسلیم کرلیا گیا۔(۳) اس کے علاوہ کونسل کی کثرت رائے کو رد کرنے کا اختیار بھی گورنر جنرل کو دے دیا گیا، اس قانون سے ایسٹ انڈیا کمپنی صرف ایک تجارتی کمپنی ہی نہیں رہی بلکہ ہندوستان میں ایک سیاسی قوت بن گئی، ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دی، جس سے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بنیاد اور مستحکم ہوگئی، یہ تھا غالب کے عہد کا سیاسی پس منظر۔

(۱) اترمدھیہ کالین بھارت، اودھ بہاری پانڈے، یونیورسٹی پریس الہ آباد، ۱۹۶۵ء، ص ۴۰۱۔
(۲،۳) ڈاکٹر ایشوری پرساد، اے نیو ہسٹری آف انڈیا، ریوائزڈ ایڈیشن (اردو) ص ۴۱۱، ۴۱۲۔

مرزا غالب ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے، غالبؔ نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ دِلّی اور آگرہ کے چند معزز خاندانوں میں سے ایک تھا، یہ خاندان عام انسانوں کے مقابلہ میں بادشاہوں اور ان کے خاندانی معاملوں، منصب داروں اور ان کی سازشوں، مرہٹوں، روہیلوں، نوابین اودھ اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں، اور ان کی باہمی رقابتوں سے زیادہ آشنا تھا، غالبؔ کے دادا قوقان بیگ خان ''اپنے باپ سے ناراض ہوکر محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان چلے آئے'' (۱) دِلّی میں نواب ذوالفقار الدولۃ کی مدد سے وہ شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے اور نقارۂ نشان کے ساتھ ملازم ہوئے، پرگنہ پہاسو جو انگریزوں نے بیگم سمرو کو دیا تھا ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر ہوا، غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان الور کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے، راؤ راجا بختاور سنگھ والی الور کی خدمت کرتے ہوئے ایک جنگ میں لڑتے ہوئے کام آئے، مرزا عبداللہ بیگ خان کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی دیکھ بھال کا بار ان کے چھوٹے بھائی مرزا نصر اللہ بیگ خان نے اٹھایا، نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار تھے، ''۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے اس علاقے پر چڑھائی کی تو مرزا نصر اللہ بیگ نے ہتھیار ڈال دیئے'' (۲) اور انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی، لارڈ لیک نے نصر اللہ بیگ خاں کو انگریزی فوج میں چار سو سوار کا سالار بنا دیا، اور سترہ سو روپیہ تنخواہ مقرر کردی، اس کے علاوہ نصر اللہ بیگ نے اپنی سیاسی تدبر سے سونک اور سونسا، لاکھ سوا لاکھ سالانہ آمدنی کے پرگنے جو بھوت پور ریاست کے نواح میں تھے، ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے چھین لئے، جز لیک نے خوش ہوکر یہ دونوں پرگنے بھی انہیں دے دیے، اس واقعہ کے دس گیارہ مہینے بعد ہاتھی سے گر کر نصر اللہ بیگ کی وفات ہوگئی، نصر اللہ بیگ خاں کی خدمات کے صلے میں ان کی اولاد کمپنی بہادر کے وظیفہ کی مستحق سمجھی گئی، ۱۸۱۰ء میں تیرہ برس کی عمر میں غالبؔ کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خاں کی گیارہ سالہ صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوگئی، نواب احمد بخش خاں انگریزوں کے بہت بڑے دوست اور دہلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، شادی کے بعد غالب دہلی چلے آئے، گویا بچپن ہی سے غالبؔ مغلوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی سرپرستی سے بالواسطہ فیضیاب رہے۔

غالبؔ نے جب ہوش سنبھالا تو نئی اور پرانی اقدار میں کش مکش اور تصادم شروع ہو چکا تھا، مختلف تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے، فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کا مقصد انگریز سول اور فوجی ملازمین کو ہندوستانی زبان بالخصوص اردو سے واقف کرانا تھا، لیکن اس کے برعکس دلی کالج کے قیام (۱۸۲۵ء) کا مقصد ہندوستانی نوجوانوں کو مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم وفنون اور انگریزی زبان سے واقفیت کرانا تھا جس سے مغربی فکر کے اثرات بھی ہندوستانی ذہن پر پڑنے لگے تھے، جس نے

(۱) ذکر غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمٹید، نئی دہلی، پانچواں ایڈیشن، فروری ۱۹۷۶، ص ۲۱۔
(۲) ذکر غالب، مالک رام، ص: ۲۹۔

غیر محسوس طریقے پر معاشرت، تہذیب، افکار ہر سطح پر ہندوستانی زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

غالبؔ کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی، ایک طاقتور برطانوی حکومت کی شکل اختیار کر لی تھی، ہندوستان کا آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر صرف نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، یعنی ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا تھا''، برطانوی سامراج کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اس بات کا اشارہ ہو چلا تھا کہ برائے نام مغل حکومت کا چراغ بہت جلد گل ہو جائے گا، غالب اپنے شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون کے نام ۱۸۵۴ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا، قطعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں، وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجئے اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھئے گا؟ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں، اور کبھی نہیں جاتا، اور یہ محبت خود چند روزہ ہے، اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم اب کے ہی نہ ہو، اب کے ہو تو آئندہ ہو''۔(۱)

جب اودھ انگریزوں کے تابع ہو گیا تو غالبؔ اپنے دلی کرب کا اظہار کرتے ہوئے قدرؔ بلگرامی کو ۲؍فروری ۱۸۵۷ء کو لکھتے ہیں:

''تباہی ریاست اودھ نے، باآں کہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ کر دیا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے، اللہ یہ اللہ ہے''۔

غالب کے عہد میں زبردست سیاسی اور تاریخی واقعہ ''غدر'' ہے، ہندوستان کی جدید تاریخ میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ جسے ہندوستانی مورخین پہلی جنگ آزادی سے موسوم کرتے ہیں، انگریزوں نے اسے ''غدر'' کا نام دیا، یہ ہماری سیاسی و معاشرتی تاریخ کا ایک ایسا اہم واقعہ جو بیک وقت زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہوا، ''۱۱؍مئی پیر کے دن صبح کے وقت میرٹھ کی فوج شہر میں داخل ہوئی، چار مہینے اور چار دن انگریز شہر سے بے دخل رہے، ۱۴؍ستمبر ۱۸۵۷ء کو وہ دوبارہ دہلی میں داخل ہوئے، ۸؍ستمبر کو شہر مکمل طور پر ان کے قبضے میں آ گیا''(۲) اس زمانے کے حالات غالبؔ نے اپنی فارسی کتاب ''دستنبو'' میں بھی لکھتے ہیں، لیکن خطوط میں مرزا نے اس انقلاب کا جو حال بیان کیا ہے، جنہیں پڑھ کر تخیل کے سامنے اس وقت کے حالات کا ایک نقشہ مرتب ہو جاتا ہے اور نگاہِ تصور وہ سب کچھ دکھنے لگتی ہے جو مکتوب نگار دکھانا چاہتا ہے، یہاں تک کہ خطوط نگار کے محسوسات میں بھی قاری شریک ہو جاتا ہے، ''غدر کے زمانے میں مرزا دلّی سے بلکہ گھر سے باہر نہیں نکلے، اگرچہ فتح دہلی کے بعد مہاراجا پٹیالہ کی طرف سے حکیم محمد خاں مرحوم اور ان کے ہمسایوں کے

(۱) انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۷ء، ص ۵۱، ۵۷۔
(۲) غلام رسول مہر۔

مکان پر جس میں ایک مرزا بھی تھے حفاظت کے لئے پہرہ بیٹھ گیا تھا'' (۱) جس سے وہ گورے سپاہیوں کی لوٹ مار سے محفوظ رہے، اس کے باوجود مرزا کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، غدر میں مرزا کی بیوی کے تمام زیور اور قیمتی کپڑے کالے صاحب کے مکان سے لٹ گئے، بدقسمتی سے ان ہی دنوں ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہوا، جن حالات سے دلّی شہر اس وقت گزر رہا تھا ان کے تجہیز و تکفین میں سخت دشواری ہوئی، غدر میں مرزا کی آمدنی بالکل مفقود ہوگئی تھی، ان کے دوستوں نے اس زمانے میں ان کی خبر گیری کی، منشی ہرگوپال تفتہ، لالہ مہیش داس، منشی ہیرا سنگھ درد، پنڈت شیو جی رام اور ان کے بیٹے بال مکند نے ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ''دستنبو'' میں غالب نے ان سب کا ذکر کیا ہے۔

غالب اس حقیقت سے بہ خوبی آشنا تھے کہ ہندوستان کا مستقبل اب انگریزوں کے ہاتھ میں ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستانیوں کو شکست ہوگئی تو غالب انگریزوں کے ساتھ ہو گئے، اس پر آشوب دور میں ہر شخص اپنی جان و آبرو بچانے کی فکر میں تھا غالب نے بھی وہی کیا، غالب نے اپنے مکتوب میں غدر کے حالات شعوری طور پر لکھے ہیں تاکہ وہ اپنے احباب کو دلّی کے حالات سے باخبر رکھنا چاہتے تھے۔

جب انگریز شہر پر قابض ہو چکے تھے حکیم غلام نجف خاں کو ۱۹ر جنوری ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں:

''حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا، لٹا نہیں، کسی محکمے میں ابھی تک بلایا نہیں گیا، معرض باز پُرس میں نہیں آیا، آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے''۔ (۲)

حکیم غلام نجف خاں کو ایک مکتوب میں دلّی کی بے یقینی کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''جو دم ہے غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں، بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں، قلم ہاتھ میں لئے پر جی بہت لکھنے کو چاہتا ہے، مگر کچھ نہیں لکھ سکتا، اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے، ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ (۳)

غالب کش مکش میں مبتلا تھے، اس کشمکش کی نشاندہی اس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو حکیم نجف علی خاں کو لکھا:

''انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک تم ہم جیتے ہیں، زیادہ اسے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا''۔ (۴)

(۱) یادگار غالب، مولانا حالی، شانتی پریس الہ آباد، ۱۹۷۰ء، ص ۳۵۔

(۲، ۳) اردوئے معلّٰی، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل، حصہ اول جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۳۴، ۴۳۳۔

(۴) اردوئے معلّٰی، سید مرتضیٰ حسین، حصہ اول جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۳۶، ۱۸۳، ۱۸۴۔

آخری فقرے نہایت معنی خیز ہیں، اوراس کیفیت کی غمازی کرتے ہیں جوانسان ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' کی کشمکش میں محسوس کرتا ہے۔اس طرح ۳؍فروری ۱۸۵۸ء کے خط میں جومرزا تفتہ کے نام ہے ایک بہت ہی مختصر سا جملہ لکھتے ہیں، جس میں بے بسی انتہا پر ہے:

''بھائی بری آبنی ہے، انجام اچھا نظر نہیں آتا، قصہ مختصر یہ کہ قصر تمام ہوا''۔(۱)

غالب کواپنی بربادی اور تباہی کا غم تو تھا ہی لیکن عزیزوں دوستوں اور شاگردوں کے قتل نے غالبؔ کے دل ودماغ کو ہلا دیا تھا، جون جولائی ۱۸۵۸ء کومرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں، جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں، انگریز کی قوم میں سے، جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا، اور کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست، اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سووہ سب کے سب خاک میں مل گئے، ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو! ہائے! اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔''(۲)

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''مع زن وفرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں''(۳)

۲۸؍نومبر ۱۸۵۹ء کو یوسف مرزا کو ایک خط میں ہجوم کی داستان سناتے ہیں۔

''میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا، آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے، اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آ گیا ہو تو کیا عجب ہے؟ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے، پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں، مظفر الدولۃ، میر ناصر الدین، مرزا آشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضی خاں اور مرتضی خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا، حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میگش، اللہ اللہ! ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق، حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے، کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے، گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے، کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ وتار ہے''۔(۴)

(۱) اردوئے معلیٰ، سید مرتضی حسین، حصہ اول جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۳۶، ۱۸۳، ۱۸۴۔
(۲) انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۲۷-۲۸۔
(۳) اردوئے معلیٰ، سید مرتضی حسین، حصہ اول جلد دوم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۴۳۶، ۱۸۳، ۱۸۴۔
(۴) انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۵۷، ۵۔

انگریزوں کے بارے میں غالبؔ کے تاثرات خواہ کچھ ہوں، لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال، بہادر شاہ ظفر کی معزولی اور دلّی کی تباہی کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے خامہ سے آہ ضرور نکلی ہے، ۲۳؍دسمبر ۱۸۵۸ء کو میر مہدی کو لکھتے ہیں:

''چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے، حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ وخشت ڈال کر بند کر دیا، تلّی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا، شہر کی آبادی کا حکم خاص وعام کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں، تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جوں بخت کے سالے علی بیگ جے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی، بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز سے چڑھائی ہوگئی، دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں''۔(۱)

یہاں ایک لفظ ''دیکھئے'' سے غالبؔ نے بادشاہ کی بے بسی اور بے چارگی کو ظاہر کر دیا ہے۔

انگریز فاتح مفتوح کے تمام آثار کو مٹا رہے تھے، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو طاقت کے بل پر ختم کرنے کے بعد دہلی کو حسب مرضی آباد کرنے لگے، بے پناہ تباہی اور بے اندازہ غارت گری کے بعد انگریز اب عمارتوں کو ڈھا رہے تھے، غالبؔ جیسے حساس شخص کے لئے جن کو اپنی تہذیبی اقدار اپنے وجود سے زیادہ عزیز تھیں، ایک خط مورخہ ۲۸؍جولائی ۱۸۵۹ء کو نواب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں جس میں حسرت وویرانی کا سماں قابل دید ہے:

''آغاز باقر کا امام باڑہ، اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزاخانہ ہے، ایک بناء قدیم رفیع شود، اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا، یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں، ایک ٹھنڈی سڑک، اور ایک آہنی سڑک، محل ان کا الگ الگ، اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارک بھی شہر میں بنے گا، اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا، محبوب کی دکانیں، بہیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے سے خاص بازار تک یہ سب میدان ہو جائے گا، یوں سمجھو کہ اموجان کے دروازہ سے قلعہ کے خندق تک، سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے، آج جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہوگئے ہیں، کیوں میں دلی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہل شہر ہی نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولہے میں ڈالوں''۔(۲)

غالبؔ کے خطوط محض واقعات کی دستاویز نہیں، بلکہ ان میں اپنے تاثرات کا بھی اظہار کیا ہے، تاثراتی خصوصیت کی وجہ سے یہ خطوط ہماری ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عمارتوں کے ڈھائے جانے سے غالبؔ افسردہ ہیں، میر مہدی مجروح کو ۸؍نومبر ۱۸۵۹ء کو لکھتے ہیں:

''جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا، دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی، ''دارالبقا'' فنا ہو جائے گی، رہے نام اللہ کا، خاں چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈہے گا، دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے، باقی خیر وعافیت ہے''۔(۳)

(۱) انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۵۷، ۵۔
(۲) اردوئے معلّٰی، سید مرتضیٰ حسین فاضل، حصہ اول جلد دوم، ص ۶۴۷۔
(۳) اردوئے معلّٰی، سید مرتضیٰ حسین فاضل، حصہ اول جلد اول، ص ۳۰۶-۳۰۷۔

''رہے نام اللہ کا''، ''باقی خیر و عافیت ہے'' لکھ کر اپنے دلی دکھ کا اظہار کیا ہے۔

میر مہدی مجروح کو ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں:

''پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا، مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا، مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے، اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو، کا مکان ہو جائے، یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نصب تھا، اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کے دروازہ بند ہو گیا، فصیل کے کنگورے کھلے رہے، باقی سب اٹ گیا، کشمیری دروازے کے حال تو دیکھ گئے ہو، اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا، پنجابی کٹرا، دھوبی واڑا، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرا، جرنیل کی بیوی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا، قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا، تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا، اللہ اللہ! دلّی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں''۔(۱)

میر مہدی مجروح کو ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''شہر چپ چاپ، نہ کہیں پھاوا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے، نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے، دلّی شہر خموشاں ہے''۔(۲)

غدر کے بعد غالبؔ بارہ سال زندہ رہے، ان بارہ برسوں تک اس اجڑے دیار کی ایک ایک اینٹ کو حسرت سے دیکھتے رہے، اس سلسلے میں مرزا نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو بہت بڑی تعداد میں خطوط لکھے ہیں جن میں بعض خطوط نہیں نثری مرثیے ہیں، ہر چیز کا ماتم ہے، چاندنی چوک کا ماتم، پھول والوں کے میلے کا ماتم، دلّی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی بربادیوں کا ماتم کرتے ہوئے ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء کو میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

''آؤ میاں سید زادہ آزادہ، دلّی کے عاشق دل دادہ، ڈھئے ہوئے ''اردو بازار'' کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم''۔

نظام الدین ممنونؔ کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہؔ، سو خاموش، دوسرا غالبؔ، وہ بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلّی! وائے دلّی! بھاڑ میں جائے دلّی''۔(۳)

غدر کے بعد برطانوی سامراج کے استبداد کے نتائج ظہور میں آ رہے تھے، حکومت کی جانب سے انتقامی کارروائیوں کا

(۱،۲) انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶، ۱۵-۱۹، ۲۳۔

(۳) انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶، ۱۵-۱۹، ۲۳۔

سلسلہ تھما نہیں تھا، بے چارگی عام تھی، ۵/دسمبر ۱۸۵۷ء کو ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مبالغہ نہ جاننا، امیر، غریب سب نکل گئے، جورہ گئے تھے، نکالے گئے، جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے، مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے، اور باز پرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں'' .... اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا بہت بڑی بات ہے، رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پائے جاتے ہیں، جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے، کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں''۔

غرض کہ غالب کے خطوں میں انگریزوں کی زیادتیوں اور سختیوں کی طرف بڑے معنی خیز اشارے بھی ملتے ہیں، انگریزوں کی نظر میں اصل مجرم صرف مسلمان ہی تھے، وہی زیادہ تر ظلم کا نشانہ بنے، انہیں کی جائدادیں ضبط ہوئیں، ۵/دسمبر ۱۸۵۷ء کو ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

''واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں، ہندو البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں .... ابھی دیکھا چاہئے، مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں''؟

جب مسلمانوں کو شہر میں آباد ہونے کا حکم نہ ملا تو مجبور ہو کر ان میں سے بعض لوگوں نے شہر کے باہر ہی مکان بنانے شروع کردیئے، ۲/فروری ۱۸۵۹ء کو میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان، دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھادو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنادو، اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں، جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بہ قدر مقدور نذرانہ دے، اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے، روپیا دے، اور ٹکٹ لے، گھر برباد ہوجائے، آپ شہر میں آباد ہوجائے، آج تک یہ صورت ہے، دیکھئے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں، یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں، الملك لله والحكم لله''۔(۱)

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے نتیجے میں جو اقتصادی بحران دلّی پر محیط ہوا تھا، اس کے بڑے مضر اثرات مرتب ہوئے تھے، اور دلّی کے شرفاء و امراء کی اخلاقی قدروں کو زبردست ٹھیس لگی تھی، شاہی خاندان کے افرادوں کی مصیبتیں بیان کے قابل نہیں، ۱۶/فروری ۱۸۶۲ء کو چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

''معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں، اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں''۔

(۱) انتخاب خطوط غالب، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵، ۲۴، ۷۔

حالات مجموعی طور پر بد سے بدتر ہو گئے تھے، لوگوں کے کھانے پینے کے لالے پڑے گئے تھے، اشیائے خوردنی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، چودھری عبدالغفور سرور کو اگست ۱۸۶۰ء کے ایک میں لکھتے ہیں:

''غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے، میوہ کے مول اناج بکتا ہے، ماش کی دال ۸ سیر، باجرہ ۱۲ سیر، گیہوں ۱۳ سیر، چنے ۱۶ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی''۔

غالب کے عہد میں امراء نام کے امیر رہ گئے تھے، ان کی ریاست اور امارت ختم ہو چکی تھی، لیکن جاگیردارانہ نظام کی وضع داری، معاشرے کے رگ و پے میں رچی ہوئی تھی، غالبؔ بھی اسی نظام کے نمائندہ تھے، ان کے خطوط میں مفلسی اور عُسرت کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں، ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھتے ہیں:

''وہ عزت اور وہ ربط ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں؟ روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے''۔(۱)

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غالبؔ کو دلّی، اہل دلّی اور خود اپنی تباہی کا غم تھا، اس انقلاب میں بہ قول غالب ''جان و مال و ناموس و مکان و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے''، شہر دلی کے حالات، اس وقت کی فوجی حکومت کے مظالم، اہل شہر کی خانماں بربادی اور دار و گیر کے قیمتی اشارے ان خطوط میں مل جاتے ہیں۔

ان خطوط کو غالبؔ نے یہ سوچ کر نہیں لکھا تھا کہ اس سے مورخ کو کچھ مواد ملے گا، اس مواد کی قدر و قیمت خطوط کی شکل میں ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ خط نجی ہوتے ہیں جو صرف مکتوب الیہ تک محدود سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن خط زندہ شئی ہوتی ہے، خط ایک دل کی صدائیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں، مکتوب نگار کسی بھی عہد کا ہو، اگر مکتوب نگار کو زندگی کا فہم و ادراک ہے، اگر وہ انسانی نفسیات کا رمز شناس ہے، تو اس کے لکھے ہوئے خطوط کو کسی بھی عہد کا مکتوب الیہ پڑھے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ وہ اسی زمانے میں پہنچ گیا اور مکتوب نگار کا مخاطب وہی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں دلّی اجڑنے کے واقعات تاریخی کتابوں میں بھی درج ہیں اور غالبؔ کے عہد میں پہنچ گئے ہیں اور دلی کو اجڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، غالبؔ نے اپنے اسلوب سے ماضی میں روح پھونک دی ہے، روائی تحریر کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غدر کے واقعات آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا ہے، غالبؔ نے ایک مورخ سے زیادہ خوبصورتی سے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے، خطوط میں ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی بے بسی، سلطنت کے انحطاط اور تہذیب کے زوال کا حال، عکس ہونے کی وجہ سے خطوط غالب کی اہمیت آفاقی ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

(۱) اردوئے معلّٰی، سید مرتضیٰ حسین فاضل، حصہ اول جلد دوم، ۱۹۹۶ء، ص: ۷۹۵۔
(۲) اردوئے معلّٰی، سید مرتضیٰ حسین فاضل، حصہ اول جلد اول، ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۹، ۲۳۳۔

باب الفتاوی

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ:
کوئی شخص جوتے چپل کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن وسنت کی رو سے جواب دیں، والسلام۔

الجواب بعون اللہ الوھاب:

صورت مسئولہ میں واضح ہو کہ جوتے چپل کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ وہ نجاست وگندگی سے پاک ہو، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" إذا جاء أحدكم إلى المسجد فلينظر فإن رأى في نعليه قذرا أو أذى فليمسحه وليصل فيهما "۔ (سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی النعل، ح:۶۵۰) یعنی جب تم میں سے کوئی مسجد میں آئے تو وہ دیکھے کہ اگر اس کے جوتوں میں کوئی ناپاک یا تکلیف دہ چیز لگی ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے جوتوں سے اسے صاف کردے اور ان میں نماز پڑھ لے۔

اس حدیث سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ جوتوں میں اگر نجاست وغیرہ لگی ہے اور انہیں پاک مٹی سے پوچھ یا رگڑ لئے جائیں تو وہ پاک ہو جاتے ہیں۔

ایک حدیث میں جو کہ حضرت شداد بن اوس ؓ سے مروی ہے، یہ ہے کہ اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ نے فرمایا: "خالفوا اليهود فإنهم لا يصلون في نعالهم ولا خنافهم " (سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی النعل، ح۶۵۲)

یعنی یہودیوں کی مخالفت کرو (یعنی تم جوتوں کے ساتھ بھی نماز پڑھو) کیونکہ وہ اپنے جوتوں اور موزوں میں نماز نہیں پڑھتے۔

حضرت انس ؓ سے پوچھا گیا کہ "أكان النبي ﷺ يصلي في نعليه قال: نعم "(صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ فی النعال: ۳۸۶، ۵۸۵۰، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب جواز الصلاۃ فی النعلین ح:۵۵۵)

یعنی رسول اللہ ﷺ اپنے نعلین میں نماز ادا فرماتے تھے؟ حضرت انس ؓ نے جواب دیا "ہاں"۔

ان تمام احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنے جوتوں کے ساتھ نماز (مسجد میں ہو یا غیر مسجد) پڑھ سکتا ہے۔

لیکن ہمارے نزدیک (مسجد کے آداب، صفائی ستھرائی کا پاس ولحاظ وخیال رکھتے ہوئے جوتوں کو مناسب جگہ اتار کر نماز پڑھنا) بہتر ومناسب ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے جوتوں کو اتار کر اپنے قریب ہی رکھنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنے دونوں پیروں کے درمیان رکھے، دائیں بائیں رکھ کر دیگر مصلیوں کو تکلیف نہ پہنچائے، اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ فرماتے ہیں: "إذا صلى أحدكم فيخلع نعليه فلا يوذيهما أحدا، ليجعلهما بين رجليه أو ليصل فيهما" (سنن ابی داود، کتاب الصلاۃ، باب المصلی إذا خلع نعلیہ أین یضعھما ح:۶۵۵) یعنی جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے اور اپنے جوتے اتار دے تو اپنے جوتے سے دوسرے کو تکلیف نہ دے اور انہیں اپنے دونوں پیروں کے درمیان رکھ لے، یا انہیں میں نماز پڑھ لے۔

ھذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب وعلمہ أتم وأحکم
حررہ: ابوعفان نورالہدی عین الحق سلفی مالدہی
جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس

الجواب صحیح
محمد رئیس ندوی
جامعہ سلفیہ بنارس

☆☆☆